اپریل ۲۰۰۰ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

محترم **ڈاکٹر اسرار احمد** مدظلہ کی تالیف

ایجاد و ابداعِ عالم سے عالمی نظامِ خلافت تک

تنزل اور اِرتقاء کے مراحل

شائع ہو گئی ہے

جس میں

- حیاتِ ارضی کا ارتقاء
- تکمیلِ تخلیقِ آدم
- عطاءِ خلعتِ خلافت
- رحمِ مادر میں تخلیقِ آدم کے مراحل کا اعادہ

جیسے بہت سے اہم موضوعات پر قرآن و سنت کی روشنی میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس ضمن میں ڈارون تھیوری کے باعث ذہنوں میں اٹھنے والے بہت سے سوالوں کے بھی تسلی بخش جوابات دیئے گئے ہیں۔ لہٰذا آج ہی اس نادر کتاب کی کاپی محفوظ کرائیے۔

قیمت : **20** روپے ○ عمدہ طباعت ○ صفحات : **60**

ملنے کا پتہ

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

قرآن اکیڈمی '36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور فون : 3-5869501 فیکس : 5834000

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

جلد :	۴۹
شمارہ :	۴
محرم الحرام	۱۴۲۱ھ
اپریل	۲۰۰۰ء
فی شمارہ	۱۰/-
سالانہ زر تعاون	۱۰۰/-

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زر تعاون برائے بیرونی ممالک

- امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا' نیوزی لینڈ — 22 ڈالر (800 روپے)
- سعودی عرب' کویت' بحرین' قطر' عرب امارات بھارت' بنگلہ دیش' افریقہ' ایشیا' یورپ' جاپان — 17 ڈالر (600 روپے)
- ایران' ترکی' اومان' مسقط' عراق' الجزائر' مصر — 10 ڈالر (400 روپے)

ترسیل زر : مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور (رجسٹرڈ)

مقام اشاعت : 36۔کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور 54700 فون : 03-02-5869501
فیکس : 5834000 ای میل : anjuman@brain.net.pk.

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی : 67۔گڑھی شاہو' علامہ اقبال روڈ' لاہور
فون : 6316638-6366638 فیکس : 6305110

پبلشر : ناظم مکتبہ مرکزی انجمن' طابع : رشید احمد چودھری مطبع : مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

☆ عرض احوال _____ ۳
حافظ عاکف سعید

☆ تذکرہ و تبصرہ _____ ۷
بھارت کے ساتھ صلح حدیبیہ طرز کی مفاہمت
ڈاکٹر اسرار احمد

☆ اک دیا اور بجھا (۲) _____ ۳۵
مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
ڈاکٹر اسرار احمد

☆ بحث و نظر _____ ۵۸
اجتہاد — ایک ضرورت' ایک نعمت
صاحبزادہ خورشید گیلانی

☆ لمحہ فکریہ (۲) _____ ۶۳
تجھے کیا ملے گا نماز میں؟
ابو عبدالرحمٰن شبیر بن نور

☆ گوشہ خواتین _____ ۷۶
شرعی پردہ اور ہماری خواتین
مسز عاتکہ خان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ احوال

رفقائے تنظیم اسلامی کا سالانہ تربیتی اجتماع ان شاء اللہ حسب اعلان ۲ تا ۵/ اپریل قرآن آڈیٹوریم لاہور میں منعقد ہو گا۔ زیرِ نظر شمارہ جب تک قارئین کے ہاتھوں میں پہنچے گا' توقع ہے کہ اجتماع کا آغاز ہو چکا ہو گا اور ملک بھر سے کھنچ کر لاہور میں جمع ہونے والے رفقاءِ تنظیم اپنے اس انقلاب آفریں سبق کو تازہ کرنے کے ساتھ ساتھ کہ جس نے انہیں ان کی دینی ذمہ داریوں کا شعور ہی نہیں بخشا آمادۂ عمل بھی کیا ہے' غلبہ و اقامت دین کے مبارک قافلے میں شریک اپنے ہم مقصد ساتھیوں سے مل کر اس جذبۂ رحمت و اخوت میں بھی اضافے کا سامان کر رہے ہوں گے جس کا جامع عنوان "رُحَمَآءُ بَیۡنَھُمۡ" ہے ـــــ راقم نے سالانہ اجتماع کے حوالے سے چند روز قبل "ندائے خلافت" میں جو چند سطور تحریر کی تھیں' قارئین میثاق کی بھی نذر ہیں :

"یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ "جانتا ہوں میں یہ امت حامل قرآں نہیں!" کے مصداق امت کا ایک عظیم حصہ دین کی حقیقت سے بے خبر اور اپنی دینی ذمہ داریوں کے شعور سے قطعی محروم اور بے گانہ ہے اور محدود مذہبی تصورات کے جال میں گرفتار ہے۔ مزید ستم ظریفی یہ ہے کہ امت کا وہ مختصر سا طبقہ جو دین کے جامع تصور سے آشنا اور اپنے دینی فرائض سے مناسب حد تک آگاہ ہے' اس کی ایک عظیم اکثریت وسیع تر دینی فرائض کی ادائیگی کے لئے عملی جدوجہد سے گریزاں ہے جس کا سب سے بڑا سبب "مال و دولت دنیا اور رشتہ و پیوند" کی محبت ہے جس کی جکڑ بندی انہیں اس راہ میں قدم اٹھانے سے روکے ہوئے ہے ـــــ کون نہیں جانتا کہ آج پورے کرۂ ارضی پر دجالی فتنہ اور دجالی تہذیب کا تسلط ہے۔ مادہ پرستی' خود غرضی' ہوا و حرص کی پوجا' حصولِ دولت کی دوڑ کے ساتھ ساتھ تنازع للبقاء کی جنگ بھی شدت کے ساتھ جاری ہے۔ سودی معیشت پر مبنی سرمایہ دارانہ نظام اور مادر پدر آزاد مغربی تہذیب نے (یہ دونوں درحقیقت یہودی سازش کا شاخسانہ ہیں)' جو گل کھلائے ہیں اس کے نتیجے میں انسان درحقیقت شرفِ انسانیت سے محروم ہو کر درندوں اور حیوانات کی صف میں شامل ہو چکا ہے ـــــ ان حالات میں لائق صد مبارکباد ہیں وہ لوگ جنہوں نے اپنی دینی ذمہ داریوں کی ادائیگی اور بالخصوص دین حق

کے غلبہ و نفاذ اور نظامِ خلافت کے قیام کی خاطر "زمانہ باتو نہ سازد تو بازمانہ ستیز" کے انداز میں معاشرہ اور باطل نظام کے خلاف پیہم جدوجہد اور پنجہ آزمائی کی خاطر جماعتی نظم میں شرکت کی ہے۔ جو سُنّت و سیرتِ رسول ﷺ کی روشنی میں اس انقلابی جدوجہد میں سرگرمِ عمل ہیں جس کا آغاز خود اپنی ذات اور اپنے گھر کی چار دیواری میں اسلامی معاشرت و معیشت کے نفاذ سے ہوتا ہے۔

اپنے معاشرے اور ماحول سے ہی نہیں پورے کرۂ ارضی پر مسلط باطل طاغوتی نظام سے بھی ٹکر لینے والے ملک بھر میں پھیلے ہوئے ان دیوانوں کا اجتماع جہاں اس بنیادی نظریہ فکر کی تجدید و پختگی کا باعث بنے گا کہ جس نے انہیں ایک ایسے مضبوط اور مقدس رشتے میں جوڑ دیا ہے جو خون اور نسب سے بالاتر ہے' وہاں اللہ کی رحمت سے اُمید ہے کہ اس اجتماع میں شرکت کے نتیجے میں وہ اس جوش و ولولہ اور جذبۂ عمل سے بھی سرشار اپنے گھروں کو واپس لوٹیں گے جو آئندہ ایک سال ان کیلئے عملی اعتبار سے زادِ راہ اور قیمتی توشہ ثابت ہو گا۔ اللّٰھم وفقنا ان نجاھد فی سبیلک باموالنا وانفسنا (آمین یارب العالمین)"

☆ ☆ ☆

امریکی صدر بل کلنٹن جنوبی ایشیا کا دورہ کر کے واپس جا چکے ہیں۔ یہ ان کا بڑا "کرم" ہے کہ انہوں نے خواہ مختصر وقت کے لئے ہی سہی' پاکستان کو بھی "شرفِ میزبانی" بخشا۔ پاکستانی قوم کے نام جناب کلنٹن کا پیغام' جو دھمکی' سرزنش اور ناصحانہ وعظ و تلقین کا ایک ملا جلا مرقع تھا' پاکستانی قوم کے لئے عبرت کے ایک تازیانے سے کم نہیں! ـــــ یہی وہ عالمی قوت ہے جس کی وفاداری کا دم بھرتے ہمیں نصف صدی سے زائد عرصہ بیت چکا ہے۔ جسے آج تک ہمارے حکمران اور سیاست دان اللہ کی ذات سے زیادہ قابل بھروسہ اور زیادہ صاحب قوت و اختیار گردانتے رہے ہیں۔ جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ہم امریکہ اور عالمی مالیاتی اداروں کی خوشنودی کی خاطر آج تک سودی نظام کو جاری رکھ کر اللہ اور رسولؐ کی جانب سے اعلانِ جنگ کی دھمکی اور مخالفت کو نظر انداز کرتے آئے ہیں' حالانکہ وفاقی شرعی عدالت دس سال قبل بینک انٹرسٹ کے خلاف تاریخی فیصلہ صادر کر چکی ہے۔ اس امریکہ نے آج گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے دیر نہیں لگائی۔ درپردہ "بے وفائی" تو ہمیشہ سے اس کا وطیرہ رہی ہے' اب اس نے صاف الفاظ میں میں "گڈ بائی" بھی کہہ دیا ہے اور واضح طور پر بھارت کے پلڑے میں اپنا تمام وزن ڈالنے کا عندیہ دیا ہے۔ کاش کہ اب بھی ہماری

قوم کو ہوش آ جائے۔ امیر تنظیم نے حال ہی میں "نوید خلافت کانفرنس" میں اپنے صدارتی خطاب میں اس صورتِ حال پر مختصر تبصرہ کرتے ہوئے بہت صحیح فرمایا تھا کہ امریکہ کا یہ طرزِ عمل دُور رس نتائج کے اعتبار سے ہمارے لئے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ بقول شاعر ؎

تو نے اچھا ہی کیا دوست سہارا نہ دیا
مجھ کو لغزش کی ضرورت تھی سنبھلنے کے لئے!

☆ ☆ ☆

۳۱/مارچ کو مسجد دار السلام لاہور میں اپنے خطابِ جمعہ میں امیر تنظیم اسلامی نے صدر کلنٹن کے دورے اور پاکستانی قوم سے ان کے خطاب کے حوالے سے اپنے تبصرے میں جن فکر انگیز خیالات کا اظہار فرمایا ان کا خلاصہ پریس ریلیز کی صورت میں درج ذیل ہے :

"صدر کلنٹن کے دورۂ جنوبی ایشیا کے بعد پاکستان ایک فیصلہ کن دوراہے پر آ کھڑا ہوا ہے۔ اب پاکستان کو امریکہ کی ڈکٹیشن پر عمل کرتے ہوئے بھارت کے تابع مہمل بن کر ذلت کی زندگی گزارنے یا پاکستان کے قیام کی نظریاتی اساس یعنی "اسلام" سے سچی وابستگی کے باوقار راستے میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہو گا۔ روس کے ٹکڑے ہونے کے بعد امریکہ اور اس کے مغربی اتحادیوں کے لئے اس خطے میں پاکستان کی اہمیت ختم ہو چکی ہے۔ لہٰذا امریکی صدر نے اپنی تقریر میں ہمیں جو نصیحت کی ہے اس کے بین السطور اصل پیغام یہ ہے کہ ہم اپنی نظریاتی اساس سے وابستگی ختم کر کے مکمل طور پر مغربی جمہوری نظام کو اختیار کر لیں۔ جس کا دوسرے الفاظ میں مطلب یہ ہے کہ قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کا فیصلہ اور توہین رسالتؐ کا قانون بھی ختم کیا جائے۔ صدر کلنٹن نے اپنی تقریر میں ہمیں یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ اگر ہم اپنا نیو کلیئر پروگرام رول بیک کرنے کے ساتھ ساتھ جہادی تنظیموں پر پابندی' دینی مدارس کے خلاف کریک ڈاؤن اور طالبان سے روابط ختم کر کے امریکہ کو خوش کرنے کی راہ اختیار کریں گے تو صرف اسی صورت میں وہ ہمیں زندہ رہنے کا حق دیتے ہوئے ہماری امداد جاری رکھیں گے۔ بصورتِ دیگر ہماری معیشت جو پہلے ہی دم توڑ چکی ہے' ہمارے لئے سوہانِ روح بن جائے گی۔

امریکی ایجنڈے کو تسلیم کر لینے کا مطلب بھارت کو علاقائی سپر پاور ماننے اور عالمی مالیاتی اداروں کے مطالبات پورے کرنے کے لئے اپنے عوام کا خون نچوڑنے کے مترادف ہو گا۔ تاریخ کے اس نازک ترین مقام پر پاکستان کو فیصلہ کرنا ہے کہ وہ امریکہ اور بھارت کے مفادات کو پورا کرتے ہوئے ذلت کا راستہ اختیار کرتا ہے یا اپنی نظریاتی اساس یعنی اسلام سے تعلق مضبوط کر کے باعزت راستے

کا انتخاب کرتا ہے۔ اگرچہ دوسرا راستہ بہت مشکل ہے لیکن اس راستے پر چلنے سے اللہ کی مدد ہمارے ساتھ ہوگی اور اس راستے کی تمام مشکلیں بتدریج آسان ہو جائیں گی۔

موجودہ صورتحال سے نپٹنے کے لئے حکمرانوں کو چاہئے کہ وہ شریعت اسلامی کے نفاذ کے عمل کو تیزی سے بروئے کار لائیں۔ حکومت کو اس معاملے میں اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات سے فائدہ اٹھانا چاہئے جس پر تحقیق اور محنت کا کثیر سرمایہ صرف ہوا ہے۔ اندرونی اور بیرونی سود کا فوری خاتمہ کیا جائے کہ اس کے بغیر ہماری معیشت کے سدھرنے کا کوئی امکان نہیں۔ چین کی جانب سے دوستی اور تعاون کی پیشکش کو غنیمت سمجھتے ہوئے قبول کرنا چاہئے اور طالبان کے ساتھ مکمل یکجہتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کنفیڈریشن کی طرف پیش رفت کرنی چاہئے۔

موجودہ حکمرانوں کو ان حالات میں سوچ سمجھ کر درست راستہ اختیار کرنا چاہئے۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حکومت امریکی مفادات کو پورا کرنے کے لئے رضامند ہو گئی ہے۔ کیونکہ چیف ایگزیکٹو نے کلنٹن کے دورے کے بعد کہا ہے کہ وہ بھارت سے مسئلہ کشمیر پر مذاکرات اور جہادی تنظیموں کے کشمیر میں اثر و رسوخ کو کم کرانے کے لئے تیار ہیں۔ ان کا یہ کہنا اس معاملے میں پسپائی اختیار کرنے اور ڈکٹیشن لینے کے مترادف ہے۔ اگر فوجی حکمرانوں نے بھی یہی کرنا تھا تو نواز شریف کا تختہ الٹنے کی کیا ضرورت تھی۔ نواز حکومت کا اصل جرم بھی تو یہی تھا کہ اس نے بھی خود کو بھارت اور امریکہ کے ساتھ ہم آہنگ کر لیا تھا۔ یونین کونسلوں میں عورتوں کو مردوں کے برابر سیٹیں دے کر آخر ہم کس تہذیب کی پیروی کر رہے ہیں۔ یہ فیصلہ کر کے تو ہم نے گویا مغرب کی پیروی کرتے ہوئے اسے بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اگر مغرب کی تقلید کرنی ہی ہے تو عورت اور مرد کو یونین کونسل یا پارلیمنٹ کی سیٹ پر برابری کی بنیاد پر مقابلہ کرنا چاہئے۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ اگر حکومت نے امریکی صدر کے حالیہ ایجنڈے پر عمل کرتے ہوئے پاکستان میں مغرب کے سیکولر جمہوری تصورات اور مغربی تہذیب کو فروغ دینے کی کوشش کی تو اس کا نتیجہ تو اگرچہ اللہ ہی کے علم میں ہے لیکن اس کا غالب امکان موجود ہے کہ مذہبی، دینی، جہادی اور بنیاد پرست عناصر کا حکومت کے ساتھ تصادم اور محاذ آرائی کا معاملہ ہو جائے جو کسی بھی صورت میں پاکستان کے حق میں بہتر نہیں ہوگا"۔OO

یہود و ہنود کے خلاف دو طرفہ جنگ میں مجوزہ حکمتِ عملی :

بھارت کے ساتھ صلح حدیبیہ طرز کی مفاہمت

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ

کا مسجد دارالسلام میں ۲۵ فروری ۲۰۰۰ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد تلاوتِ آیات :

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَھُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓی اَوْلِیَآءَ ۘ بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ؕ وَمَنْ یَّتَوَلَّھُمْ مِّنْکُمْ فَاِنَّہٗ مِنْھُمْ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ○ فَتَرَی الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ یُّسَارِعُوْنَ فِیْھِمْ یَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓی اَنْ تُصِیْبَنَا دَآئِرَۃٌ ؕ فَعَسَی اللّٰہُ اَنْ یَّاْتِیَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِہٖ فَیُصْبِحُوْا عَلٰی مَآ اَسَرُّوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ نٰدِمِیْنَ ○ ﴾

(المائدۃ : ۵۱، ۵۲)

﴿ لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَۃً لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا الْیَھُوْدَ وَالَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَھُمْ مَّوَدَّۃً لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰی ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّ مِنْھُمْ قِسِّیْسِیْنَ وَرُھْبَانًا وَّاَنَّھُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ ○ ﴾

(المائدۃ : ۸۲)

ادعیہ ماثورہ کے بعد فرمایا :

حضرات! سورۃ المائدہ کی ان تین آیات میں سے پہلی دو آیات ۵۱ اور ۵۲ ہیں' جبکہ تیسری اسی سورۂ مبارکہ کی آیت ۸۲ ہے۔ پہلی دو آیات کا مفاد اور حاصل یہ ہے کہ' مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ "وہ یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا حمایتی' دوست اور پشت پناہ نہ سمجھیں۔ اس لئے کہ وہ درحقیقت ایک دوسرے کے دوست' حمایتی درست' اور پشت

پناہ ہیں"۔ یہ بات مثبت انداز میں تو آ ہی گئی تھی لیکن اس کے بعد بڑے سخت تہدیدی انداز میں یعنی دھمکی کے انداز میں فرمایا گیا : ﴿ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ ﴾ "جو کوئی بھی تم میں سے ان کا ساتھی بنے گا اور انہیں اپنا ولی اور پشت پناہ سمجھے گا تو پھر وہ انہی میں سے شمار ہو گا"۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہودی یا نصرانی ہی گردانا جائے گا' وہ مسلمان اور محمد رسول اللہ ﷺ کا امتی شمار نہیں ہو گا۔ ﴿ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ ﴾ "اور اللہ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا"۔

اگلی آیت میں فرمایا : "تم دیکھو گے ان لوگوں کو جن کے دلوں میں روگ ہے (وہ بیماری جو بعد میں آگے بڑھ کر واضح طور پر نفاق کی شکل اختیار کر لے اسے قرآن مجید مرض سے تعبیر کرتا ہے) وہ انہی میں گھسے جاتے ہیں (انہی یہود و نصاریٰ سے دوستی کرتے ہیں اور انہی سے ملتے ہیں) اور کہتے یہ ہیں کہ ہمیں اندیشہ ہے کہ ہم پر کوئی مصیبت نہ آ جائے"۔ یعنی ہم اگر یہودیوں اور نصرانیوں کے ساتھ اپنا میل جول رکھتے ہیں اور ان کے ساتھ دوستی گانٹھ رہے ہیں تو وہ اس لئے کہ ہمیں تحفظ حاصل ہو جائے اور کوئی مصیبت ہم پر مسلّط نہ ہو جائے۔ "بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو فتح مبین عطا کرے یا خاص اپنے اختیار اور اقتدار سے کوئی ایسی شکل پیدا کر دے کہ پھر ایسے لوگ اپنے اس نفاق پر جسے انہوں نے اپنے دلوں میں چھپایا ہوا تھا نادم ہو جائیں"۔ انہیں سخت ندامت کا سامنا ہو اور انہیں پچھتانا پڑے کہ ہم نے یہ طرزِ عمل کیوں اختیار کیا تھا۔

ان دو آیات میں اہلِ ایمان کو مستقل حکم دیا جا رہا ہے۔ اس سے کسی درجے میں کچھ "متضاد" بات ہے جو اسی سورۂ مبارکہ کی آیت ۸۲ میں آ رہی ہے۔ لفظ "متضاد" میں نے جان بوجھ کر استعمال کیا ہے تاکہ ان کا فوری تقابل (Simultaneous Contrast) سوالیہ نشان بن کر سامنے آ جائے۔ فرمایا :

"تم لازماً یہ دیکھو گے کہ اہل ایمان سے دشمنی میں شدید ترین وہ ہیں کہ جو یہودی ہیں اور جو مشرک ہیں۔ اور تم اہل ایمان سے محبّت اور دوستی میں قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ (عیسائی) ہیں۔ یہ اس لئے ہے کہ ان میں درویش لوگ موجود ہیں اور وہ لوگ بھی جو تارکِ دنیا ہیں اور ان میں تکبّر اور گھمنڈ نہیں ہے"۔

ایک ظاہری تضاد اور اس کی تعبیر

آیت ۸۲ میں یہ کہا جا رہا ہے کہ نصاریٰ یہودیوں اور مشرکوں کے مقابلے میں مسلمانوں کے دوست ہیں' جبکہ پہلی دو آیتوں (۵۱' ۵۲) میں فرمایا گیا کہ یہود و نصاریٰ کا آپس میں گٹھ جوڑ ہے اور اہلِ ایمان کو یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ ان میں سے کسی کی دوستی اختیار نہ کرو' کیونکہ ان کا دراصل آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ گٹھ جوڑ ہے۔ یہ بظاہر ایک تضاد ہے اور اس تضاد کو مَیں نے کافی عرصہ پہلے اپنے ایک خطابِ جمعہ ہی میں واضح کیا تھا' جس کے بارے میں ہندوستان کے ایک دینی پرچے نے لکھا تھا کہ واقعتاً یہ بات پہلی مرتبہ کہی گئی ہے اور بہت اہم ہے۔ قرآن مجید کے علم کا معاملہ ایسا ہی ہے کہ ضروری نہیں کہ اس کے تمام نکات کی وضاحت ہو چکی ہو' بلکہ وقت آنے پر اس کے بہت سے نکات ابھی واضح ہوں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((لَا تَنْقَضِیْ عَجَائِبُهٗ)) "اس کتاب کے عجائب کبھی ختم نہیں ہوں گے"۔ چنانچہ بہت سے نکات ایسے ہو سکتے ہیں جو لوگوں پر ابھی واضح نہ ہوئے ہوں اور اللہ تعالیٰ انہیں آہستہ آہستہ کھول دے گا' اور کسی پر اللہ کا خاص فضل ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کسی ایسے نکتے کی طرف اس کی راہنمائی کر دیتا ہے۔

اس ضمن میں درحقیقت تضاد جو رفع ہوتا ہے وہ اس اعتبار سے ہے کہ آیت ۸۲ میں جو بات آئی ہے وہ نزولِ قرآن کے وقت بالفعل موجود تھی اور آیت ۵۱' ۵۲ میں جو بات آئی ہے وہ مستقبل کی پیشین گوئی ہے اور اس وقت ہمارے زمانے میں وہ لفظ بہ لفظ بلکہ حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی ہے۔ دورِ نبویؐ میں مسلمانوں سے سب سے زیادہ دشمنی مشرکینِ مکّہ کو تھی اور دوسرے نمبر پر یہودیوں کو تھی' بلکہ ایک اعتبار سے یہودیوں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف زیادہ بغض و عناد موجود تھا۔ وہ میدان میں آ کر جنگ نہیں کر سکتے تھے' لہٰذا سازشیں کرتے تھے اور مشرکینِ مکّہ کو ابھارتے رہتے تھے کہ تم باہر سے مدینہ منوّرہ پر حملہ آور ہو جاؤ' ہم اندر سے بغاوت کریں گے' تاکہ بقول ان کے محمدؐ رسول اللہ (ﷺ) کا "فتنہ" (معاذ اللہ) ختم ہو جائے۔ یہودیوں کی طرف سے

سازشوں کا یہ معاملہ بارہا ہوا ہے۔ لیکن دوسری طرف جہاں تک عیسائیوں کا معاملہ ہے وہ مسلمانوں سے بغض و عداوت کا نہیں رہا۔ حبشہ کے بادشاہ نجاشی رضی اللہ عنہ عیسائی تھے جو سورۂ مریم کی چند آیات سن کر ایمان لے آئے تھے۔ قیصرِ روم ہرقل بہت بڑا عیسائی بادشاہ تھا۔ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کے پاس جب رسول اللہ ﷺ کا نامۂ مبارک پہنچا تو وہ اسلام کی حقانیت کا قائل ہو گیا تھا اور ایمان لانا چاہتا تھا لیکن اپنے اہل دربار کے دباؤ میں آ گیا۔ اُس وقت تک ابو سفیان ایمان نہیں لائے تھے اور وہ ایک قافلے کو لے کر وہاں آس پاس پہنچے ہوئے تھے۔ غالباً غزہ کی پٹی میں ہوں گے، کیونکہ فلسطین کے ساحل پر تو وہ اپنے قافلے لے کر جایا کرتے تھے اور ہرقل بھی یروشلم کے اندر آیا ہوا تھا۔ اُس تک جب اسلام کی دعوت پہنچی تو اس نے لوگوں سے دریافت کیا کہ آیا عرب کا کوئی قافلہ اِس طرف آیا ہوا ہے؟ اسے بتایا گیا کہ ہاں ایک قافلہ آیا ہوا ہے جس کا سردار ابو سفیان ہے جو کہ قریش کے سرداروں میں سے بڑا سردار ہے۔ ہرقل نے ابو سفیان اور ان کے ساتھیوں کو اپنے دربار میں بلایا اور ان کے مابین جو مکالمہ ہوا وہ بڑی تفصیل سے احادیث کی کتابوں میں موجود ہے۔ اس نے ابو سفیان سے محمدؐ رسول اللہ ﷺ اور دین اسلام کے بارے میں ایسے probing سوالات کئے جن سے یہ بات خود بخود واضح ہو گئی کہ جن صاحب کا خط آیا ہے وہ نبیٔ برحق ہیں۔ ہرقل ابو سفیان سے پوچھ رہا تھا: کیا پہلے کبھی ان کے مابین اس طرح کی بات دیکھنے میں آئی تھی؟ کیا ان کے خاندان میں پہلے کبھی کوئی بادشاہی تو نہیں تھی کہ انہیں اپنی کھوئی ہوئی بادشاہت حاصل کرنے کے لئے اس طرح کا دعویٰ کرنا پڑا ہو؟ ان کا کردار کیسا ہے؟ ان پر کون لوگ ایمان لا رہے ہیں؟ ان لوگوں کے اندر استقامت کا کیا عالم ہے؟ کیا لوگ ان پر ایمان لانے کے بعد الٹے پاؤں پھر جاتے ہیں؟ اور ابو سفیان اس کے سوالات کے ٹھیک ٹھیک جوابات دے رہے تھے۔ پھر اس نے پوچھا: کیا ان سے تمہارا کوئی مقابلہ بھی ہوا ہے؟ کہا: ہاں مقابلہ ہوا ہے۔ اس نے پوچھا: پھر اس کا کیا نتیجہ نکلا؟ ابو سفیان نے کہا: ابھی تو ہمارے مابین جھولا جھول رہا ہے، کبھی انہیں فتح ہو جاتی ہے کبھی ہمیں فتح ہو جاتی ہے۔

اُس وقت ابو سفیان کے ساتھ چند اور عرب بھی موجود تھے۔ ایمان لانے کے بعد

ابو سفیان خود کہتے تھے کہ بار بار میرا جی چاہتا تھا کہ جھوٹ بول دوں۔ اس لئے کہ ہرقل سوال کر کے مجھ سے وہ باتیں اگلوا رہا تھا جن کے نتیجے میں حضور ﷺ کی حقانیت ثابت ہو رہی تھی' لیکن میں یہ بھی سوچتا تھا کہ میرے ساتھ جو عرب آئے ہوئے ہیں وہ کیا کہیں گے کہ اتنا بڑا سردار ہو کر جھوٹ بول رہا ہے' لہٰذا میں نے کوئی بات جھوٹی نہیں کہی۔ اس مکالمے کے نتیجے میں ہرقل اسلام اور پیغمبرِ اسلام کی حقّانیت کا قائل ہو گیا تھا' لیکن اس کے دربار میں موجود مذہبی قائدین بطریق' اسقف وغیرہ اور سپہ سالار اور جرنیلوں نے غصّے سے آوازیں نکالنی شروع کر دیں کہ کیا ہمارا شہنشاہ اسلام قبول کرنے والا ہے؟ دربار کی اس کیفیت کو دیکھ کر ہرقل ٹھٹھک گیا' ورنہ صورت حال واضح ہو کر اس کے سامنے آ چکی تھی۔

اسی طرح شاہِ مصر مقوقس جس کا پایۂ تخت سکندریہ تھا' وہ ایک پادری بھی تھا' کیونکہ وہاں پر ایک مذہبی حکومت قائم تھی۔ اس کے پاس جب رسول اللہ ﷺ کا نامۂ مبارک پہنچا تو اس نے اس کی بڑی تعظیم کی اور قاصدین کا بڑا اکرام کیا۔ اس نے آپؐ کی خدمت میں تحائف بھی ارسال کئے اور حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کو بھی روانہ کیا' جن کے بطن سے حضور ﷺ کو اللہ نے ابراہیم کی ولادت عطا فرمائی۔ ان کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا اور اس موقع پر حضور ﷺ کی آنکھوں میں آنسو بھی آ گئے تھے۔ دُلدُل (گھوڑا) بھی شاہ مقوقس ہی نے آپؐ کے لئے بھیجا تھا۔ اس حوالے سے یہ نوٹ کر لیجئے کہ اُس وقت عیسائیوں کا طرزِ عمل یہودیوں کے طرزِ عمل سے بالکل برعکس محبّت و مودّت کا تھا۔ مسلمانوں کے بدترین دشمنوں میں ایک طرف مشرکینِ مکّہ اور دوسری طرف یہودی تھے۔ چنانچہ آنحضور ﷺ کے زمانے میں جو صورت حال تھی وہ سورۃ المائدہ کی آیت ۸۲ میں بیان کی گئی ہے کہ :

> "تم اہلِ ایمان کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے' اور ایمان لانے والوں کے لئے دوستی میں قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جنہوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں...."

آپ کو معلوم ہے کہ حضور ﷺ کو راہبوں نے پہچانا تھا۔ بحیرہ راہب نے آپؐ کے

بچپن میں آپؐ کو پہچانا اور ابو طالب سے کہا کہ ان کی حفاظت کرنا' ان کو بچا کر رکھنا' ہو سکتا ہے یہودی ان کو نقصان پہنچائیں۔ اس آیت میں یہودیوں اور عیسائیوں کے طرزِ عمل کا تقابل کیا گیا ہے۔ لیکن اِس وقت کی صورت حال یہ ہے کہ اب ان کا گٹھ جوڑ ہے' یہودیوں نے عیسائیوں کو فتح کر لیا ہے اور ان کو اپنا تابع بنا لیا ہے۔ یہ ہے اصل میں اس ظاہری تضاد کو رفع کرنے کی صورت کہ آیت نمبر ۵۱' ۵۲ میں مستقبل کی پیشین گوئی ہے اور یہ صورت حال وہ ہے جو اس وقت ہمیں درپیش ہے' جبکہ آیت نمبر ۸۲ میں عہدِ نبویؐ کی صورت حال کو بیان کیا گیا ہے۔

پاکستان کو درپیش دوہرے خطرات

اِس وقت ہماری صورت حال کیا ہے؟ آج جب میں ان آیات پر غور کر رہا تھا تو حیران ہوا کہ ہمیں اس وقت ان دونوں صورتوں کے ساتھ سابقہ درپیش ہے۔ ایک طرف پاکستان کو بھارت کی بدترین دشمنی سے سابقہ ہے جو کہ "اَلَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا" ہیں۔ آج پوری دنیا میں مکّے والی بُت پرستی سوائے ہندوستان کے اور کہیں نہیں ملے گی' اگرچہ ہندوستان کی بھی جو ایلیٹ سوسائٹی ہے اس میں بُت پرستی وغیرہ ختم ہو چکی ہے۔ وہاں کے پڑھے لکھے طبقے میں اب ہندو مَت کو مذہب کی حیثیت حاصل نہیں رہی' وہ سیکولرازم کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ ہندو مت کوئی ہمارا مذہب نہیں ہے' وہ تو ایک تہذیب ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کے ہاں بہرحال بُت پرستی ایک ادارے (institution) کی حیثیت سے موجود ہے' مندر آباد ہیں' بُت موجود ہیں اور ان کے لئے rituals موجود ہیں' ان کے ہاں بڑے بڑے میلے ہوتے ہیں اور بُتوں کو دھو دھو کر ان کا دھوون پیا جاتا ہے' جیسے ہمارے ہاں قبروں کو دھو کر پانی پیا جاتا ہے۔ وہ بھی بُتوں کو کبھی دودھ سے نہلاتے ہیں اور کبھی عرقِ گلاب سے انہیں غسل دیتے ہیں۔ پوری دنیا میں آپ کو اس طرح کی بُت پرستی جیسی اُس وقت مکّہ میں موجود تھی' ایک institution کی حیثیت سے کہیں نہیں ملے گی' سوائے ہندوستان کے۔ چنانچہ ایک تو اس اعتبار سے ہمیں اس صورت حال کا سامنا ہے کہ ہمیں مشرکین سے مقابلہ درپیش ہے۔ دوسری طرف

یہودیت کا سیلاب نیو ورلڈ آرڈر کی صورت میں امڈا چلا آ رہا ہے' جو در حقیقت جیو ورلڈ آرڈر ہے۔ اس کی تعمیل اور تکمیل کے لئے وہ عیسائیوں پر پوری طرح غلبہ حاصل کر چکے ہیں اور اب آخری show down ہونے والا ہے' جس کے لئے "Armegaddon" کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ بائبل کے آخری باب مکاشفہ (Revelation) میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔ یہ تاریخ انسانی کی عظیم ترین جنگ ہو گی جس کا ذکر احادیث میں بھی "الملحمۃ العظمٰی" کے نام سے ملتا ہے۔ اس کے لئے اب سٹیج تیار ہو رہی ہے اور زمانہ بڑی تیزی کے ساتھ اس کی طرف پیش قدمی کر رہا ہے۔

ایک طرف تو ہمیں ہنود و یہود دونوں سے سابقہ ہے' دوسری طرف چونکہ آج یہودی عیسائیوں پر اپنا تسلط جما چکے ہیں اور عیسائیت گویا یہودیت کے پنجے میں ہے' لہٰذا آج عیسائی بھی مسلمانوں کے حریف ہیں۔ علامہ اقبال نے ۱۹۰۶-۷ء میں جو بات کہی تھی کہ ع "فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے!" وہ بات آج سو فیصد درست ثابت ہو چکی ہے۔ اُس وقت یہ کیفیت ابھی پہلی سٹیج پر تھی' لیکن اب اس سے آگے کی ایک سٹیج آ چکی ہے' اور اس کی ایک تیسری سٹیج بھی ہے جس کا تذکرہ مَیں بعد میں کروں گا۔ آج پورے عالم عیسائیت کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے' صرف فرنگ اس معنی میں نہیں۔ اس لئے کہ فرنگ کا اُس وقت کا سردار برطانیہ تھا۔ یہود کے سب سے پہلے آلۂ کار WASP (White Anglo Saxon Protestants) بنے ہیں۔ انہی کی وجہ سے ۱۹۱۷ء میں یہود کو یہ حق دیا گیا کہ وہ فلسطین میں آ کر آباد ہو سکیں۔ اُس وقت برطانیہ کا وزیر خارجہ بالفور تھا۔ ۱۹۱۷ء کے بالفور ڈکلیریشن کے مطابق یہودیوں کو فلسطین میں آ کر جائیداد یعنی مکان اور زمینیں خریدنے کا حق حاصل ہو گیا۔ یہ برطانیہ کے ذریعے سے ہوا تھا۔

آج پاکستان کو خاص طور پر دونوں طرح کی صورت حال سے سابقہ درپیش ہے۔ پاکستان کے مغرب میں عالمِ اسلام ہے' اگرچہ مشرق میں بھی مسلمان ممالک موجود ہیں۔ بنگلہ دیش ایک بڑا مسلم ملک ہے' جو بظاہر تو آزاد ہے لیکن اِس وقت وہ بھارت کا طفیلی بن چکا ہے اور جب تک کہ حسینہ واجد کی حکومت وہاں پر موجود ہے یہ صورت حال برقرار

رہے گی۔ تاہم وہاں ایک مضبوط اپوزیشن بھی موجود ہے اور حسینہ کا تختہ کسی وقت بھی الٹ سکتا ہے اور دوسری حکومت آسکتی ہے۔ پھر اس سے آگے انڈونیشیا ہے' جسے اس وقت سخت حالات کا سامنا ہے۔ عیسائی مشنریز نے ایک وقت میں دعویٰ کیا تھا کہ ہم ۲۱ویں صدی کے آغاز میں پورے انڈونیشیا کو عیسائی بنالیں گے۔ وہ اپنے عزائم میں پوری طرح تو کامیاب نہیں ہو سکے لیکن اکثر و بیشتر آپ دیکھتے ہوں گے کہ وہاں پر عیسائیوں اور مسلمانوں کے مابین کشت و خون اور غارت گری ہو رہی ہے' جس کے نتیجے میں اس کے بہت بڑے جزیرہ تیمور کا آدھا حصّہ (مشرقی تیمور) کٹ کر وہاں خالص رومن کیتھولک عیسائی ریاست قائم ہو چکی ہے اور ایک دوسری جگہ پر بھی مسلمانوں اور عیسائیوں کے مابین خانہ جنگی ہو رہی ہے۔ اسی طرح کی خانہ جنگی دوسری طرف نائیجیریا میں بھی ہو رہی ہے۔ نائیجیریا کے اندر مختلف علاقوں میں شریعت اسلامی کے نفاذ کی تحریک بڑے زور شور سے چل رہی ہے۔ ایک جگہ جہاں شریعت نافذ کی جا چکی ہے وہاں بڑا زبردست کشت و خون ہو رہا ہے' عیسائی مزاحمت کر رہے ہیں کہ ہم اسے نافذ نہیں ہونے دیں گے۔ باقی دوسرے حصّوں میں بھی اس کا امکان ہے۔

اس اعتبار سے ہمارے سامنے صورت حال نہایت پیچیدہ ہے کہ ایک طرف ہمیں مشرکین یعنی بھارت کی مخالفت کا سامنا ہے جو ہمارا پیدائشی دشمن ہے۔ دوسری طرف صیہونیت کا سیلاب ہے جس نے عالمِ عیسائیت کو اپنے پنجے اور گرفت میں لے لیا ہے۔ تو گویا کہ جو صورت حال سورۃ المائدہ کی آیت ۸۲ میں بیان ہوئی ہے وہ پاکستان کو درپیش ہے کہ اسے یہود اور مشرکین کی عداوت کا سامنا ہے' چاہے یہ صورت حال بظاہر افغانستان کے لئے نہیں ہے کیونکہ بھارت افغانستان کے لئے تو کوئی خطرہ نہیں ہے' اسی طرح بھارت ایران اور عرب ممالک کے لئے تو خطرہ نہیں ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ بھارت چاہتا ہے کہ پورے علاقے میں ایک منی سپر پاور کی حیثیت سے اس کا حلقہ اثر قائم ہو جائے۔ پاکستان کے ساتھ اس کا معاملہ تو نفسیاتی بنیادوں پر ہے' اس نے پاکستان کے وجود کو نفسیاتی طور پر تسلیم ہی نہیں کیا۔ ان کے دلوں میں تو یہ آرزو پروان چڑھ رہی ہے کہ جب بھی موقع ملے گا پاکستان کو ختم کریں گے اور اکھنڈ بھارت قائم کریں گے۔

لیکن پوری ملّتِ اسلامیہ، جس میں پاکستان بھی شامل ہے، اسے بہت بڑا خطرہ مغرب سے درپیش ہے، خصوصاً اسرائیل سے۔ اسرائیل درحقیقت چھوٹا سا ملک ہے جو کہ tip of the iceberg کی مانند ہے۔ جیسے آپ کو معلوم ہے کہ آئس برگ پانی کی سطح کے نیچے ہوتا ہے جو کہ نظر نہیں آتا۔ یہ اتنا بڑا ہوتا ہے کہ جہاز اس سے ٹکرا کر ٹوٹ جاتے ہیں، لیکن اس کی صرف tip نظر آ رہی ہوتی ہے۔ اسی طرح درحقیقت یہودی سازش کی جڑیں بہت گہری ہیں اور پورا عالم عیسائیت اس کے پنجے میں پھنس چکا ہے۔

دوررُخی جنگ میں پاکستان کے لئے حکمتِ عملی

اس دوہری صورت حال میں ہمارے لئے حل کیا ہے؟ اس ضمن میں آج میں بہت اہم بات کہہ رہا ہوں، جس پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ بہت سے حضرات تو شاید میری یہ بات سننے کے لئے ذہنی طور پر تیار بھی نہ ہوں اور اس کو فوراً رد کر دیں۔ لیکن آپ میرے دلائل پر ذرا غور کر لیجئے، ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ میری بات کے لئے آپ کے ذہن کو کھول دے۔ میرے نزدیک اس کا علاج "صلح حدیبیہ" ہے۔ صلح حدیبیہ کو قرآن مجید میں نبی کریم ﷺ کے لئے فتح مبین قرار دیا گیا ہے ﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا﴾ ـــــ جن حالات میں صلح حدیبیہ ہوئی ذرا ان پر ایک نظر ڈال لیجئے۔

صلح حدیبیہ ۶ ہجری میں ہو رہی ہے۔ اُس وقت تک مشرکینِ مکّہ کے ساتھ چار سالہ کھلی جنگ جاری تھی اور ان کے ساتھ تین بڑی جنگیں (غزوۂ بدر، غزوۂ اُحد، غزوۂ احزاب) ہو چکی تھیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک چیز جو ہمارے ذہنوں میں دبی رہ جاتی ہے وہ سیرت میں موجود ہے کہ ہر جنگ کے ساتھ ایک ضمیمہ یہود کے ساتھ بھی چل رہا تھا۔ چنانچہ غزوۂ بدر کے بعد بنو قینقاع کا معاملہ ہوا اور انہیں مدینہ سے نکالا گیا۔ یہود نے جو معاہدے رسول اللہ ﷺ سے کر رکھے تھے وہ ان سے غداری کے مرتکب ہوئے۔ یہود کے تینوں قبیلے ایک ایک کر کے ان معاہدوں کو توڑتے چلے گئے، جس کے نتیجے میں پھر حضور ﷺ نے ان پر چڑھائی کی اور انہیں مدینہ سے نکال باہر کیا۔ غزوۂ احد کے بعد بنو نضیر کا معاملہ اسی طرح ہوا، اور غزوۂ احزاب کا ضمیمہ غزوۂ بنو قریظہ ہے، جس کا قرآن مجید میں

بھی ذکر موجود ہے۔

صلح حدیبیہ میں حضور ﷺ نے یہ حکمتِ عملی اپنائی کہ قریش سے صلح کرلی' حالانکہ اُس وقت صورت حال یہ تھی کہ پورے مکّے میں جوش و خروش انتہا پر تھا کہ ان مسلمانوں سے ہم کسی صورت صلح نہیں کریں گے' ہم لڑیں گے اور محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھیوں کو ختم کردیں گے۔ جیسا کہ آج بھارت نے طبلِ جنگ بجادیا ہے اور ان کی طرف سے جس قسم کے بیانات آرہے ہیں یہی صورت حال اُس وقت مکّہ میں تھی۔ حضور ﷺ اپنے چودہ سو یا اٹھارہ سو ساتھیوں کے ساتھ احرام باندھ کر تشریف لے آئے اور حدیبیہ میں آکر خیمہ زن ہوگئے۔ اب ایک نازک صورت حال پیدا ہوگئی۔ حضور ﷺ کی طرف سے اقدام ہوگیا کہ آپؐ چلے آئے' اور مشرکین یہ سمجھتے تھے کہ اگر حضور ﷺ اور ان کے ساتھیوں کو عمرے کیلئے مکّہ میں داخل ہونے دیں یہ تو ہمارے لئے موت ہے۔ اس طرح تو گویا ہم نے انہیں تسلیم کرلیا۔ چنانچہ وہ مرمٹنے کیلئے تیار تھے اور ان میں بڑا جوش و خروش تھا۔ ان میں سے کئی لوگوں نے مسلمانوں کے کیمپ کے آس پاس آکر کوشش کی کہ کسی طریقے سے انہیں مشتعل کریں کہ یہ ذرا سا ہاتھ اُٹھالیں' پھر ہمارے لئے ان کے خلاف اقدام کا جواز پیدا ہوجائے گا۔ آخر اُن کا ایک مذہبی اصول تو چلا آرہا تھا کہ جو لوگ احرام میں ہیں ان پر ہاتھ کیسے اُٹھائیں؟ آخر وہ لوگ بھی کعبے کے متولی تھے۔ مسلمان تو عمرے کے ارادے سے آئے تھے' انہوں نے ہتھیاروں کی نمائش نہیں کی اور بالکل پُرامن بیٹھے ہوئے تھے' لیکن اگر مشرکین کے اشتعال دلانے سے کسی طرح ان میں سے ایک بھی ہتھیار اُٹھالیتا یا اقدام کرلیتا تو مشرکین کو پورا جواز حاصل ہوجاتا کہ مسلمانوں کو کچل ڈالو۔ لیکن مسلمانوں نے اس موقع پر بہت زیادہ صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا۔ اور پھر بالآخر جب بیعت رضوان ہوگئی جو کہ بیعت علی الموت تھی کہ ہم سب بھی یہاں مرجائیں گے' واپس نہیں جائیں گے تب مشرکین کے ہوش ٹھکانے آئے۔ پھر بعد میں کچھ لوگ درمیان میں پڑے اور انہوں نے صلح کرائی جو کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں میں سے کسی ایک کو بھی پسند نہ آئی' اس لئے کہ وہ صلح بظاہر دب کر اور بالکل غیر مساوی شرائط پر کی گئی تھی' جس پر مسلمانوں نے کہا کہ ہم حق پر ہیں' پھر ایسی صلح کیوں کریں؟ حضرت عمر

رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جب ہم حق پر ہیں تو دب کر صلح کیوں کریں؟

صلح حدیبیہ میں یہ شرط بھی شامل تھی کہ اگر کوئی مسلمان مکّہ سے بھاگ کر ہمارے پاس آئے گا تو ہم اسے واپس کرنے کے پابند ہوں گے لیکن اگر مدینے سے کوئی مسلمان مرتد ہو کر مکے جائے گا تو مکے والے اسے واپس کرنے کے پابند نہ ہوں گے۔ یہ شرط بالکل غیر مساوی (unequal) تھی۔ ابھی یہ صلح نامہ لکھا جا رہا تھا کہ اسی وقت یہ معاملہ بھی پیش آگیا کہ ابو جندلؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آگئے جبکہ ان کو بیڑیاں اور زنجیریں پڑی ہوئی تھیں اور انہی کا باپ سہیل بن عمرو اس مصالحت کی لکھت پڑھت کر رہا تھا۔ اپنے بیٹے ابو جندل رضی اللہ عنہ کو اس نے اسلام قبول کرنے کی پاداش میں گھر کے اندر باندھا اور جکڑا ہوا تھا' جو کسی طرح زنجیریں توڑ کر وہاں پہنچ گئے۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابو جندل! اب تمہیں واپس جانا ہو گا' اس لئے کہ معاہدہ لکھا جا چکا ہے۔ انہوں نے چیخ و پکار بھی کی کہ اے مسلمانو! مجھے کن بھیڑیوں کے حوالے کیا جا رہا ہے' لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح نامہ کی شرائط کی پابندی کرتے ہوئے انہیں مشرکین کے پاس واپس بھیج دیا۔ ادھر مسلمانوں کا خون کھول رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اُٹھو' احرام کھول دو اور قربانی کیلئے جو جانور لائے ہو انہیں قربان کر دو تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کوئی بھی کھڑا نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری مرتبہ اور پھر تیسری مرتبہ یہی بات کہی لیکن کوئی اپنی جگہ سے نہیں اُٹھا۔ میں تو حیران ہوتا ہوں جب یہ سوچتا ہوں کہ اگر ابو بکر رضی اللہ عنہ ہی کھڑے ہو گئے ہوتے تو تب بھی کم سے کم یہ تو بیان کیا جاتا کہ ایک آدمی تو کھڑا ہو گیا۔ حضرت موسیٰؑ نے جب اپنی قوم سے کہا تھا کہ اب اللہ کی راہ میں جنگ کرو تو اگرچہ پوری قوم نے کورا جواب دے دیا تھا لیکن ان کے دو صحابی یوشع بن نون اور کالب بن یفنّا تو اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ یہاں حضورؐ نے تین مرتبہ کہا لیکن کوئی نہیں اُٹھا۔

اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم دل گرفتہ ہو کر اپنے خیمے میں گئے اور وہاں جا کر اُم المومنین حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ میں نے مسلمانوں سے تین مرتبہ کہا ہے کہ احرام کھول دو' لیکن ان میں سے ایک بھی نہیں اُٹھا۔ اس پر حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا نے مشورہ دیا کہ آپ کسی سے کچھ نہ کہئے' بس اپنا احرام کھول دیجئے اور قربانی کر دیجئے۔ آپ باہر نکلے'

احرام کھولا اور قربانی دی تو سب کے سب کھڑے ہو گئے۔ گویا ایک حالتِ منتظرہ کی کیفیت تھی۔ سب سوچ رہے تھے کہ شاید کوئی نئی شکل بن جائے' شاید ہمارا امتحان لیا جا رہا ہے؟ لیکن ان کے دل خون کے آنسو رو رہے تھے۔

صلح حدیبیہ کا نتیجہ : یہود کا قلع قمع

حضور ﷺ کی اس صلح کا نتیجہ کیا نکلا؟ اس کے فوراً بعد حضور ﷺ نے دوسرے دشمن یعنی یہود کے خلاف اقدام کیا۔ کیونکہ قریش صلح نامے کی شرائط کے مطابق بندھ گئے تھے اور یہودیوں کی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ بنو قینقاع اور بنو نضیر نے مدینہ سے نکلنے کے بعد خیبر میں جا کر اڈا لگا لیا تھا۔ خیبر ایک شہر کا نام نہیں' بلکہ علاقے کا نام ہے۔ یہاں بڑے بڑے مضبوط قلعے تھے جن میں سے ایک قلعے کا دروازہ اس قدر مضبوط تھا کہ اس کو توڑنے کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ میدان میں آئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی آنکھیں دکھ رہی تھیں' حضور ﷺ نے ان کی آنکھوں میں اپنا لعابِ دہن لگایا تو ان کی آنکھیں ٹھیک ہو گئیں۔ پھر حضور ﷺ نے انہیں یہ قلعہ فتح کرنے کے لئے بھیجا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس قلعے کے دروازے کو توڑ ڈالا۔ اس کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مناقب میں خاص طور پر ذکر آتا ہے۔ مسلمانوں کو جو یہ فتح حاصل ہوئی یہ صلح حدیبیہ کا نتیجہ تھی' جو بظاہر دب کر اور غیر مساوی شرائط پر کی گئی تھی۔ فتح خیبر کے نتیجے میں مسلمانوں کے ہاتھ بہت سا مالِ غنیمت آیا۔ ظاہر ہے وہاں یہودی سرمایہ داروں نے دولت کے انبار لگا رکھے تھے۔ اسی مالِ غنیمت کا ذکر سورۃ الفتح میں آیا ہے :

﴿ وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ ۚ وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝ وَّاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ۝ ﴾ (الفتح : ۲۰'۲۱)

"(اے مسلمانو!) اللہ تم سے بکثرت اموالِ غنیمت کا وعدہ کرتا ہے جنہیں تم حاصل کرو گے' فوری طور پر تو یہ فتح اس نے تمہیں عطا کر دی (یعنی صلح حدیبیہ) اور لوگوں

کے ہاتھ تمہارے خلاف اُٹھنے سے روک دیئے' تاکہ یہ مؤمنوں کے لئے ایک نشانی بن جائے اور اللہ سیدھے راستے کی طرف تمہیں ہدایت بخشے۔ اس کے علاوہ دوسری اور غنیمتوں کا بھی وہ تم سے وعدہ کرتا ہے جن پر تم ابھی قادر نہیں ہوئے اور اللہ نے ان کا احاطہ کر رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔"

بظاہر مشرکینِ مکّہ سے دب کر صلح کی گئی جس پر اہل ایمان کے دل خون کے آنسو رو رہے تھے اور ان کا خون جوش مار رہا تھا' اگرچہ حضور ﷺ کی جماعت کا جو بھی نظم قائم ہو چکا تھا اس کا یہ مظہر تھا کہ انہوں نے حضور ﷺ کے فیصلے پر سرِ تسلیم خم کر لیا۔ لیکن ایک ہے حکم کو قبول کر لینا' ایک ہے دل کی آمادگی کے ساتھ قبول کرنا۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اگر تمہاری ایک سے زیادہ بیویاں ہوں تو ان کے مابین عدل کرنا تمہارے لئے لازم ہے' لیکن دلی رجحان تمہارے اختیار میں نہیں ہے' دل اگر کسی ایک کی طرف زیادہ مائل ہے تو کوئی بات نہیں۔ حضور ﷺ نے بھی جو چیز ناپ تول میں آسکتی ہے وہ ازواجِ مطہّرات کے مابین برابر کی رکھی ہوئی تھی' ٹائم آپ سب کو برابر کا دیتے تھے' اگر نفقات کا معاملہ تھا تو وہ بھی برابر کا دیتے تھے۔ اس طرح کی جو چیزیں بھی تھیں سب برابر تھیں۔ باقی دل کا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: اے اللہ اس پر مجھ سے مؤاخذہ نہ کیجیو! اسی طرح مسلمانوں کے دل ان کے اپنے اختیار میں نہیں تھے' ان کے دل تو خون کے آنسو رو رہے تھے' لیکن پھر بھی اللہ کے رسول ﷺ کا جو حکم تھا اس کو انہوں نے بسرو چشم قبول کیا۔

اب اِس وقت کی صورت حال کی طرف آیئے جو اس پس منظر میں ہمیں درپیش ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہمیں بیک وقت دو صورتیں درپیش ہیں۔ ایک طرف یہودیوں کی دشمنی بھی ہے اور دوسری طرف ہمیں مشرکین (بھارت) کی دشمنی کا بھی سامنا ہے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ آج "مشرکینِ مکّہ" آپ کو پوری دنیا میں صرف بھارت میں ملیں گے۔ دوسری طرف یہودی ہیں' جو وہی قوم ہے جو اگلے وقتوں سے چلی آ رہی ہے' جس کا مذہب ہی نسلی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہمیں یہ صورت حال بھی درپیش ہے کہ عہدِ نبویؐ میں کم سے کم نصاریٰ یہودیوں کے ساتھ نہیں تھے' وہاں

مسلمانوں کا صرف یہودیوں سے ہی مقابلہ تھا' جبکہ اس وقت یہودی تمام نصاریٰ پر کنٹرول حاصل کر چکے ہیں۔ سب سے پہلے تو ہمیں بھارت کے بارے میں سوچنا چاہئے کہ بھارت کے ساتھ ہمارا اصل جھگڑا ایک ہی ہے' جو کہ "ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں" کے مصداق سو جھگڑوں کا ایک ہی جھگڑا ہے' اور وہ مسئلہ کشمیر ہے۔ کشمیر کے مسئلے میں پہلی مرتبہ چیف ایگزیکٹو نے کھل کر بات کہی ہے کہ ہمارے مابین اصل مسئلہ بلکہ واحد مسئلہ کشمیر کا ہے اور یہ بھی کہا کہ کسی گفتگو کا کوئی مطلب ہی نہیں جب تک کشمیر پر بات نہ ہو۔ آج سے پہلے کسی بھی حکمران نے یہ بات اس طرح کھل کر نہیں کہی تھی۔ ظاہر بات ہے سیاست دانوں کو دائیں بائیں دیکھنا پڑتا ہے' ان کے اپنے مفادات بھی ہوتے ہیں' نواز شریف صاحب کو تو چینی بھی بیچنی تھی اور کچھ بھی کرنا تھا' جس سے لوگوں کی نگاہوں میں ان کی نیّتیں داغدار ہو گئیں۔ فوج کا چونکہ ایسا مسئلہ نہیں ہے لہٰذا انہوں نے کھل کر بات کی ہے کہ اصل مسئلہ کشمیر کا ہے۔

تنازعۂ کشمیر کا تجزیہ

مسئلہ کشمیر کا اگر تجزیہ کیا جائے تو سب سے پہلی بات یہ نوٹ کیجئے' جو بہت کم لوگوں کے علم میں ہے' کہ اس ضمن میں ایک بڑی بنیادی غلطی ہم سے ہوئی ہے۔ جب تقسیم ہند کا فارمولا طے ہو رہا تھا' اور انگریز ابھی موجود تھا' تو اس وقت یہ مسئلہ سامنے آیا کہ جو دیسی ریاستیں تھیں ان کے سربراہ یا تو ہندو راجے تھے یا مسلمان نواب تھے' اور اکثر و بیشتر صورت حال یہ تھی کہ جہاں نواب مسلمان ہے وہاں آبادی کی اکثریت ہندو ہے اور جہاں ہندو راجہ ہے وہاں آبادی کی اکثریت مسلمان ہے۔ جیسا کہ ہندوستان کی سب سے بڑی اور خوشحال ریاست حیدر آباد دکن تھی' وہاں کی ۹۵ فیصد اکثریت ہندوؤں کی تھی' لیکن ریاست مسلمانوں کی تھی۔ اس کے بالکل برعکس معاملہ کشمیر کا تھا' جہاں ۹۰ فیصد مسلمان آباد تھے' لیکن اس کا راجہ ہندو یا سکھ تھا۔ اس حوالے سے کانگریس کا موقف یہ تھا کہ ان ریاستوں کے الحاق کے بارے میں فیصلہ وہاں کے عوام کے ہاتھ میں ہو گا کہ آیا وہ پاکستان کے ساتھ شامل ہونا چاہتے ہیں یا بھارت کے ساتھ۔ لیکن مسلم لیگ نے اس کے

برعکس موقف اختیار کیا کہ نہیں، کسی بھی ریاست کا فیصلہ وہاں کے راجے، مہاراجے یا نواب کریں گے۔ اس لئے کہ ہماری نگاہ حیدر آباد دکن پر تھی اور جوناگڑھ کا معاملہ بھی ایسا ہی تھا۔ اس کے علاوہ اور بھی چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں جو کہ معمولی حیثیت کی حامل تھیں۔ لیکن یہ بات ہماری نظروں سے اوجھل رہ گئی کہ حیدر آباد دکن کو تو سمندر کسی طرف سے بھی نہیں لگتا۔ ہم نے اس ریاست کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہا کہ ریاست کا فیصلہ اس کے نواب، راجے یا مہاراجے کریں گے۔ اس حوالے سے درحقیقت کشمیر کے راجہ ہری سنگھ نے بھارت کے ساتھ الحاق کرلیا تو گویا کہ ایک اعتبار سے ان کی پوزیشن مضبوط ہوگئی۔

دوسرے یہ کہ کشمیر میں فوج کشی کے معاملے میں ہم سے کمزوری کا ظہور ہوا۔ قائد اعظم نے اُس وقت کے انگریز کمانڈر انچیف کو فوج کشی کرنے کا حکم دیا تھا، لیکن وہ قائد اعظم کا حکم نہیں مان رہا تھا، بلکہ اُدھر سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا حکم مان رہا تھا، لہٰذا اس نے فوج کشی نہیں کی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ واقعتاً حالات ہی سازگار نہ ہوں، اس لئے کہ ہماری فوج ابھی مکمل طور پر منتقل ہی نہیں ہوئی تھی، ساز و سامان اور اسلحہ بھی نہیں آیا تھا، لیکن زیادہ تر جو بات مشہور ہے وہ یہ کہ کمانڈر انچیف نے قائد اعظم کا حکم ماننے سے انکار کر دیا تھا، حالانکہ اس وقت اگر ہماری طرف سے ذرا سی جرأت کا مظاہرہ ہو جاتا تو کشمیر ہمارا تھا۔ تیسری کمزوری ہم سے یہ ہوئی کہ جو آزاد قبائل کے لوگ وہاں گئے وہ لوٹ مار میں لگ گئے اور ہم نے کشمیر حاصل کرنے کا قیمتی وقت گنوا دیا۔ وہ سری نگر تک تو پہنچے ہوئے تھے، اگر سری نگر کے ایئرپورٹ پر قبضہ کرلیا ہوتا تو بھارت اپنی فوجیں وہاں لا ہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا، اس لئے کہ وہ کوئی منظم فوج تو نہیں تھی، وہ تو ایک ہجوم (mob) تھا، جس میں ہر ایک کی اپنی ڈفلی اور اپنا راگ ہوتا ہے۔ ان میں کوئی ڈسپلن تو تھا نہیں، لہٰذا وہ لوگ وہاں جا کر لوٹ مار میں لگ گئے اور جو قبضہ کرنے کا اصل وقت تھا وہ انہوں نے کھو دیا۔

میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس سازش میں ہندو شریک تھا تو انگریز نہ صرف برابر کا بلکہ اس سے بڑھ کر شریک تھا۔ یہ جو کچھ بھی ہوا ہے دو انگریزوں ماؤنٹ بیٹن اور ریڈ کلف

نے مل کر کروایا ہے۔ بھارت کی تو لازماً یہ خواہش ہو گی کہ کشمیر کا پاکستان کے ساتھ الحاق نہ ہو سکے اور یہ بھارت کے زیر قبضہ رہے' لہٰذا انہوں نے اپنا بھرپور داؤ لگایا ہو گا اور جواہر لعل نہرو نے تو اپنے ذاتی تعلقات کا سہارا بھی لیا ہو گا۔ دنیا جانتی ہے کہ نہرو کے ماؤنٹ بیٹن کی بیوی اڈوانا سے ناجائز تعلقات تھے اور وہ نہرو پر عاشق تھی۔ بہرحال انہوں نے ماؤنٹ بیٹن اور ریڈ کلف سے یہ کام کروالیا اور ہم نے تو اپنے ہاتھ کاٹ کر پہلے ہی دے دیئے تھے کہ ریڈ کلف جو بھی فیصلہ کرے گا ہمیں قبول ہو گا۔ ان چیزوں کی وجہ سے سارا معاملہ خراب ہوا۔ اور پھر ۱۹۶۲ء میں ہمیں اللہ تعالیٰ نے ایک بہت بڑا موقع دیا' جسے ہم نے امریکہ کے دباؤ اور بہلاوے میں آکر کھو دیا' جبکہ بھارت کی چین کے ساتھ پنجہ آزمائی ہو رہی تھی اور وہ بُری طرح شکست کھا رہا تھا۔ اس وقت اگر ہم ذرا سی پیش قدمی کرتے تو کشمیر ہمارا تھا۔

بہرحال کشمیر کے حوالے سے بھارت اور پاکستان کا جو پیچ پڑا ہوا ہے ہماری تمام تر صلاحیتیں اسی میں لگ رہی ہیں' ہمارے تمام مالی وسائل اسی کی نذر ہو رہے ہیں اور ہماری خارجہ پالیسی ہمیشہ سے اسی بنیاد پر چل رہی ہے کہ بھارت کے مقابلے میں ہمیں امریکہ کا سہارا چاہیئے یا فلاں کی مدد چاہیئے۔ انگریز جو ہڈی ڈال گیا ہے اس کی وجہ سے ہمارے درمیان کئی جنگیں ہو چکی ہیں اور اب جو صورت حال ہے اس پر پوری دنیا بھی پریشان ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر کہیں ایٹمی جنگ چھڑ گئی تو ظاہر بات ہے ایٹم بم صرف ہمارے پاس ہی تو نہیں ہے' ہم سے کہیں زیادہ ایٹم بم بھارت کے پاس موجود ہیں۔ بھارت نے تو ۱۹۷۴ء میں ہم سے ۲۴ برس پہلے ہی ایٹمی دھماکے کر دیئے تھے' جبکہ ہم نے ۱۹۹۸ء میں ان کے دھماکوں کے جواب میں دھماکے کئے ہیں۔ اس حوالے سے وہ ہم سے چوتھائی صدی آگے ہے۔ اگر پاکستان اور بھارت کے مابین جنگ چھڑ جاتی ہے اور اس میں ایٹمی ہتھیار استعمال ہو جاتے ہیں تو نتیجہ دو طرفہ تباہی اور بربادی ہے۔

کشمیر کے بارے میں میرا موقف

آپ کو یاد ہو گا کہ کشمیر کے بارے میں میرا مستقل موقف یہ رہا ہے کہ اس مسئلے میں

امریکہ یا اقوامِ متحدہ کی کوئی دخل اندازی قبول نہ کی جائے۔ اگر یو این او کے حوالے سے کشمیر کا مسئلہ حل ہوتا ہے اور وہاں رائے شماری ہوتی ہے' جس کے حق میں ہماری حکومت کا موقف بھی ہے' اور سب لوگ کہتے ہیں کہ اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کے تحت یہ مسئلہ حل کیا جائے' تو میرے نزدیک یہ بہت بڑی غلطی ہو گی۔ اللہ نہ کرے کہ ایسا ہو جائے' اس لئے کہ اس کا نتیجہ بڑا بھیانک نکلے گا۔ اس صورت میں ہمیں پہلے اپنی ساری فوجیں گلگت' بلتستان اور آزاد کشمیر سے نکالنی پڑیں گی' جبکہ انڈیا کو حق حاصل ہو گا کہ وہ اپنی کچھ نہ کچھ فوجیں مقبوضہ کشمیر میں رکھ سکے۔ اس سے صورت حال پاکستان کے لئے انتہائی خوفناک ہو سکتی ہے۔

دوسری بات یہ کہ اس سے پہلے کشمیر کے بارے میں امریکہ کی نیت خراب ہو گئی تھی۔ یہ چند ہی سال پرانی بات ہے کہ رابن رافیل کے بیانات "گریٹر کشمیر" کے منصوبے کے حق میں آئے تھے۔ وہ منصوبہ یہ تھا کہ پورا کشمیر آزاد ہو جائے' جس میں بلتستان' ہنزہ' گلگت اور آزاد کشمیر کے علاوہ چین کے پاس جو تھوڑا سا رقبہ لدّاخ کا ہے' جو اسے پاکستان نے دیا تھا' اسے بھی واپس لیا جائے' تاکہ تبت کیلئے راستہ مل جائے اور یہ پورا گریٹر (Greater) کشمیر ایک آزاد ریاست بنے۔ یہ منصوبہ پاکستان کیلئے ایک انتہائی خوفناک منصوبہ تھا' کیونکہ اس طرح تو مغربی استعمار کو اس خطے میں قدم جمانے کیلئے جگہ مل جائے گی۔ عالمِ عرب کے سینے میں قائم اسرائیل رقبے کے لحاظ سے ایک چھوٹا سا ملک ہے' لیکن اس کی حیثیت "tip of the iceberg" کی ہے۔ اسی طرح یہاں پر ایک بہت بڑا "اسرائیل" قائم ہو سکتا تھا جہاں سے امریکہ پورے بھارت' پاکستان' افغانستان' چین اور آزاد ترکستانی ریاستوں کو مانیٹر کرتا۔ اس حوالے سے میرا ہمیشہ سے یہ اصولی موقف رہا ہے کہ یہ کام نہیں ہونا چاہئے' نہیں ہونا چاہئے' نہیں ہونا چاہئے' بلکہ بھارت کے ساتھ دو طرفہ مذاکرات سے بات طے ہونی چاہئے اور ہمیں اس ضمن میں چین اور ایران کے good offices استعمال کرنے چاہئیں۔ لیکن اس وقت صورتحال میں جو تبدیلی آئی ہے اس حوالے سے میرے سابقہ موقف میں تھوڑی سی ترمیم ہوئی ہے۔ میں نے چار فروری کو بھی اپنے خطابِ جمعہ میں اس موضوع پر گفتگو کی تھی۔ اس وقت جنگ اور

نوائے وقت میں این این آئی کے حوالے سے خبر چھپی تھی کہ ہارورڈ یونیورسٹی کے تھنک ٹینک نے مسئلہ کشمیر کا تازہ حل تجویز کیا ہے۔ یہ وہ تھنک ٹینک ہے کہ جو امریکی انتظامیہ کو feed back کرتا ہے' پھر اس کی بنیاد پر ان کی پالیسیاں بنتی ہیں۔ اس تجویز کے دو حصّے ہیں۔ اس میں سے ایک حصّہ تو وہ ہے جو صحیح ہے کہ آزاد کشمیر' گلگت اور بلتستان' جو پاکستان کے پاس ہے' انہیں صوبوں کی حیثیت دے کر پاکستان میں ضم کر دیا جائے اور ان کا الگ status ختم ہو جائے۔ دوسری طرف ہندو اکثریت یا غیر مسلم اکثریت والے علاقے بھارت میں ضم کر دیئے جائیں' جیسا کہ تقسیم ہند کا فارمولا تھا کہ ہندو اکثریت کے علاقے' جو بھارت کے ساتھ ملحق ہیں' وہ بھارت کے ساتھ شامل ہونگے اور مسلم اکثریت کے علاقے اگر پاکستان کے ساتھ ملحق ہیں تو وہ پاکستان کے ساتھ شامل ہوں گے۔ اسی بنیاد پر کشمیر کو تقسیم کر دیا جائے کہ گلگت' بلتستان اور آزاد کشمیر پاکستان میں ضم ہو جائیں' جبکہ جموں اور لدّاخ بھارت میں ضم ہو جائیں۔ البتہ میں ہمیشہ کہتا رہا ہوں کہ صرف وادیٔ کشمیر میں ریفرنڈم کروایا جائے اور اس ریفرنڈم میں تھرڈ آپشن بھی دے دیا جائے' لیکن صورت یہ کی جائے کہ ان کو تھرڈ آپشن دے کر بھارت اور پاکستان کے مابین کوئی ایسا انتظام ہونا چاہئے کہ دنیا کی کوئی تیسری طاقت یہاں آکر قدم نہ جما سکے۔

آپ میں سے بہت سے حضرات کو یاد ہو گا کہ میں یہ بات کہتا رہا ہوں' لیکن جب ہارورڈ یونیورسٹی کے تھنک ٹینک کی تجویز آئی تو میں نے اس کا تجزیہ کیا کہ اس کا آدھا حصّہ تو صحیح ہے کہ آزاد کشمیر' گلگت' بلتستان اور ہنزہ جیسا کہ پاکستان کے پاس ہیں وہ پاکستان کے پاس رہیں اور لدّاخ اور جموں بھارت لے جائے' لیکن اس تجویز کا دوسرا حصّہ کہ درمیان والے کشمیر کو آزاد کر دیا جائے' اسے میں کہتا ہوں کہ غلط ہے۔ دراصل اس میں تین آپشن ہونے چاہئیں۔ اگر تو دیانت اور عدل و انصاف کو دیکھا جائے اور تقسیم ہند کے فارمولے کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ وادی پاکستان کو ملنی چاہئے' اس پر پاکستان کا حق ہے' کیونکہ یہ مسلم اکثریت کا ملحق علاقہ ہے۔ لیکن چونکہ یہ بات بہت کڑوی ہے اور بھارتی حکومت وہاں کی سیاسی جماعتوں اور عوام کی رائے کے پیش نظر اس کڑوی گولی کو حلق سے نیچے نہیں اتار سکتی' لہٰذا اس سے نیچے آجایئے کہ یہاں پر ایک ریفرنڈم

ہو جائے۔ ریفرنڈم کی ایک صورت تو یہ ہے کہ یا بھارت یا پاکستان ـــــ لیکن میں نے تیسری بات بھی تجویز کی کہ وادی کی حد تک ایک تھرڈ آپشن بھی دے دیا جائے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ ۱۳ جون ۱۹۴۷ء اور ۱۸ جولائی ۱۹۴۷ء کے پاکستان ٹائمز میں قائداعظم کے بیانات موجود ہیں کہ ان ریاستوں کو تھرڈ آپشن بھی ملنا چاہئے' اور یہ بات درحقیقت پارٹیشن کے فارمولے میں implied ہے' کیونکہ قائداعظم کے پیش نظر حیدرآباد دکن کا معاملہ تھا' چونکہ وہ پاکستان کے ساتھ تو نہیں مل سکتا تھا' آزاد رہ سکتا تھا' لہٰذا تھرڈ آپشن کی بات خود قائداعظم نے بھی کی ہے' اور ہمیں یہ گمان ہے کہ وادیٔ کشمیر کے اندر بھی ایک رائے یہ موجود ہے' چاہے وہ کم ہے یا زیادہ' وہ تو کبھی رائے شماری ہو گی تو پتہ چلے گا' لیکن ایک رائے بہرحال یہ موجود ہے کہ وہ آزاد ہونا چاہتے ہیں۔

یہ ہے وہ معاملہ جو میں نے چار فروری کے جمعہ میں بیان کیا تھا۔ آج میں نے یہ ساری بات اسلئے دہرائی ہے کہ اس ہفتے کے دوران دو باتیں بڑی اہم ہوئی ہیں۔ ایک تو ہمارے اس وقت کے وزیر قانون عزیز اے منشی صاحب' جو ظاہر بات ہے کوئی سیاسی آدمی نہیں ہیں' ان کا بیان اخبارات میں نمایاں طور پر شائع ہوا تھا کہ انہوں نے کسی امریکن ایجنسی کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا ہے کہ "ہماری بڑی خواہش ہے کہ کلنٹن صاحب کو ضرور پاکستان آنا چاہئے' ہمارے عوام ان سے محبّت کرتے ہیں اور وہ جو بھی تصفیہ کرائیں گے ہم اسے قبول کر لیں گے"۔ اب یہ بیان کسی معمولی آدمی کا نہیں' موجودہ وزیر قانون کا بیان ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ بیان حکومتی پالیسی کی عکاسی کرتا ہے۔ میرے علم کی حد تک صرف طاہر القادری صاحب نے اس کے خلاف بیان دیا ہے۔ اور بڑے پُرزور انداز میں کہا ہے کہ کسی وزیر کو یہ حق حاصل نہیں کہ یہ بات کہے۔ لیکن اس کے برعکس میں اس کی تائید کرتا ہوں کہ اگر کلنٹن کے Good offices استعمال ہو سکتے ہوں' اور وہ اس مسئلہ کا تصفیہ کروا دیں' تو ہمیں اس کا خیر مقدم کرنا چاہئے۔

میرے نزدیک ہمیں بھارت کے ساتھ صلح حدیبیہ کی طرز کی مفاہمت کرنی چاہئے تاکہ ہم پورے طور پر یکسو ہو کر مغربی محاذ پر اپنی توجہات مرکوز کر سکیں اور یہودیت کا جو سیلاب چلا آ رہا ہے' جس کے پنجے میں پورا عالم عیسائیت بھی ہے' اس کا مقابلہ کرنے کے

لئے ہم تیار رہیں۔ جس طرح سے رسول اللہ ﷺ نے مشرکینِ مکّہ سے معاہدہ کر کے یہودیوں کا قلعہ قمع کیا' چاہے وہ معاہدہ بظاہر بہت گر کر کیا گیا' لیکن اس کے نتیجے میں یہودیوں کے سب سے بڑے گڑھ کو توڑ کر ختم کر دیا گیا اور ان کی قوت ختم ہو گئی' یہی حکمت عملی ہمیں اس وقت اختیار کرنی چاہئے۔ اگر کلنٹن صاحب کے پاکستان آنے سے یہ مسئلہ حل ہوتا ہے تو ہمیں اس سے گریز نہیں کرنا چاہئے' کیونکہ ان کے نزدیک "گریٹر کشمیر" والا معاملہ اب سرد ہو چکا ہے۔ تاہم اگر تھرڈ آپشن کا معاملہ صرف وادی کی حد تک ہے تو میں اس کی تائید کرتا ہوں۔

بھارت سے ایک تائیدی مکتوب

ایک اہم بات یہ ہے کہ اس ہفتے کے دوران مجھے ہندوستان سے ایک صاحب کا خط ملا ہے۔ خط لکھنے والے سید شہاب الدین انڈین فارن سروس کے آدمی ہیں اور ان کا تعلق صوبہ بہار سے ہے۔ میری ان سے کئی ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ امریکہ میں بھی مَیں ان سے ملا ہوں اور ایک مرتبہ جبکہ مَیں بھارت گیا ہوا تھا میں نے ان کے گھر پر جا کر بھی ان سے ملاقات کی ہے۔ انڈین سول سروس کی طرح انڈین فارن سروس ایک انتہائی اہم سروس ہے' اس میں یہ بڑے عہدے پر فائز رہے ہیں۔ وہاں سے استعفاء دے کر سیاست میں آئے اور لوک سبھا (نیشنل اسمبلی) کے ممبر رہے ہیں۔ اِس وقت وہ سپریم کورٹ آف انڈیا دہلی میں ایڈووکیٹ کے طور پر پریکٹس کرتے ہیں۔ ۱۹۹۲ء میں جب بابری مسجد شہید کی گئی تو بابری مسجد کی ایکشن کمیٹی کے اہم لوگوں میں سے نمایاں ترین یہی دو افراد تھے' ایک تو عبداللہ بخاری صاحب جو جامع مسجد دہلی کے امام ہیں اور دوسرے یہ شہاب الدین صاحب۔ مجھے ان کا خط ملا تو ایک چیز میرے علم میں پہلی مرتبہ آئی۔ پہلے میں بیان کیا کرتا تھا کہ ایسا ہونا چاہئے کہ وادی کو خود مختاری حاصل ہو اور یہاں بھارت اور پاکستان کا کوئی مشترک انتظام (Joint Control) رہے' تاکہ باہر کی کوئی تیسری قوت وہاں آ کر قدم نہ جما پائے' لیکن میرے علم میں اس کی کوئی مثال نہیں تھی۔ سید شہاب الدین صاحب نے باقاعدہ مثال دی ہے کہ سپین اور فرانس کی سرحد پر واقع انڈورا (Andorra) کا معاملہ

ایسا ہی ہے۔ اب آپ سید شہاب الدین صاحب کا خط (اردو ترجمہ) ملاحظہ کیجئے[1]

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

میں نے آپ کے جریدہ (ندائے خلافت) کے تازہ شمارہ میں مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے آپ کی تجویز دیکھی ہے۔ مجھے خوشی ہوئی ہے کہ آپ کی یہ تجویز میری اس تجویز کے بہت مشابہ ہے جو میں شروع سے پیش کرتا آ رہا ہوں۔ میرا موقف اس حقیقت پر مبنی ہے کہ یہ ریاست ایک کثیر النسلی اور تاریخی لحاظ سے مصنوعی ساخت کی حامل ریاست ہے۔ چنانچہ شمالی علاقے اور پیر بنجال سے نیچے کے جنوب مغربی' پنجابی بولنے والے حصے کو پاکستان میں شامل ہونا چاہئے' جبکہ لداخ اور جموں کا حصہ بھارت کے ساتھ رہنا چاہئے۔ وادی کو جو جغرافیائی' لسانی اور ثقافتی طور پر ایک شے ہے' پاکستان اور بھارت کی مشترک چھتری کے نیچے مکمل داخلی خود مختاری حاصل ہونی چاہئے' جیسا کہ سپین اور فرانس کی سرحد پر واقع انڈورا (Andorra) کا معاملہ ہے۔ وادی کی تعمیر و ترقی' دفاع اور خارجی تعلقات کی ذمہ داری پاکستان اور بھارت مل کر ادا کریں۔ کشمیریوں کو پاکستان اور بھارت دونوں کے اندر آنے کی اجازت ہو' لیکن اس کے برعکس پاکستان یا ہندوستان کے کسی شہری کو وادی میں جا کر آباد ہونے کی اجازت نہ ہو۔ میرے نزدیک یہی ایک حل ہو سکتا ہے جس سے تمام فریقین یعنی بھارت' پاکستان اور کشمیریوں کے مفادات کی تکمیل ہوتی ہے۔

سید شہاب الدین

سابق ممبر پارلیمنٹ

ایڈووکیٹ سپریم کورٹ آف انڈیا

ایڈیٹر ماہنامہ "مسلم انڈیا"

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا' مجھے انڈورا کے بارے میں پہلی مرتبہ معلوم ہوا ہے' جس کا میں اعتراف کر رہا ہوں' اور پھر میں نے اٹلس میں اسے دیکھ بھی لیا ہے' ورنہ اس

---

(۱) اصل انگریزی خط جو محترم ڈاکٹر صاحب نے خطاب جمعہ کے دوران حاضرین کو پڑھ کر سنایا' میثاق کے گزشتہ شمارے میں شائع کیا جا چکا ہے۔ (مرتب)

سے پہلے تو کبھی میں نے اس کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ یہ سپین اور فرانس کی سرحد پر ایک چھوٹی سی ریاست ہے جس کے اندر یہی انتظام ہے کہ انہیں اندرونی طور پر مکمل خود مختاری حاصل ہے' لیکن سپین اور فرانس کے مابین ایک معاہدے کی رو سے وہاں کی تعمیر و ترقی' دفاع اور خارجی تعلقات کی ذمہ داری دونوں ملک مل کر ادا کر رہے ہیں۔

اسی طرح بھارت اور پاکستان بھی مل کر یہ معاملات طے کر لیں۔ کشمیریوں کو بھارت اور پاکستان کے اندر آنے جانے کی کھلی اجازت ہو۔ یعنی وہ چاہے تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھارت یا پاکستان جائیں' خواہ تجارت کے لئے جائیں' اور انہیں یہ حق بھی ہونا چاہئے کہ وہ انڈیا اور پاکستان میں جہاں چاہیں رہیں' جبکہ پاکستانیوں اور بھارتیوں کو یہ حق حاصل نہ ہو کہ وہ وادی میں جا کر آباد ہو سکیں یا وہاں جا کر زمین یا جائیداد خرید سکیں۔ اور میرے تجزیئے میں یہ بات آ رہی ہے کہ ہمیں مشرقی محاذ پر صلح حدیبیہ کی مثال کو سامنے رکھتے ہوئے بھارت کے ساتھ مصالحت کرنی چاہئے اور اس مصالحت میں اگر کلنٹن صاحب کا دورہ کسی درجے میں مفید ہو سکے تو یہ موقع ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ کہا جاتا ہے کہ کلنٹن کی بڑی خواہش ہے کہ تاریخ میں اس کا نام اس طرح لیا جائے کہ اس نے دنیا میں بہت سی جگہوں پر جھگڑے ختم کروا دیئے اور متحارب قوموں کے درمیان صلح کی بات چیت کروا دی ہے۔ یہ جو کچھ فلسطینیوں اور یہودیوں کے درمیان معاملہ ہو رہا ہے یا یہودیوں اور شامیوں کے درمیان جو بھی ہوا ہے یہ ان ہی کی کوششیں ہیں' اگرچہ وہ کامیاب ہونے والی نہیں ہیں۔ لیکن ہو سکتا ہے اگر پاکستان اور بھارت دونوں کی سمجھ میں یہ بات آ جائے کہ ہماری آپس کی لڑائی سے کسی کو کچھ حاصل نہیں ہو رہا' دونوں طرف نقصان ہی نقصان ہے' دونوں تباہ و برباد ہو رہے ہیں۔ خاص طور پر پاکستان کو اس کا بہت نقصان پہنچ رہا ہے' بھارت تو پھر بھی اتنی بڑی طاقت ہے کہ اس کے باوجود ان کی ترقی جاری ہے۔ ہم تو اپنے سارے وسائل جنگ کی آگ میں جھونک کر بھی مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ ہم بھارت سے کوئی sustained war کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ کوئی چھوٹی موٹی جھڑپ ہو جائے تو اس میں یقیناً ہمارا پلڑا بھاری رہتا ہے' لیکن اگر کسی وسیع و عریض محاذ پر ہماری اس سے جنگ ہو جائے تو ہم اس کو maintain کرنے

کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔

میں نے وہ صورت حال بھی بیان کر دی ہے جس کے پیش نظر میں نے یہ بات کہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی ایسی صورت ہو جائے کہ بھارت اور پاکستان کے مابین "صلح حدیبیہ" کا سا معاملہ ہو جائے تو واقعہ یہ ہے کہ پھر قائداعظم کا وہ خواب بھی شرمندۂ تعبیر ہو جائے گا کہ پاکستان اور بھارت کے مابین تعلقات ایسے ہوں گے جیسے کینیڈا اور امریکہ کے درمیان ہیں۔ یہ بات ریکارڈ پر ہے۔ ان سے پوچھا گیا تھا کہ پاکستان اور انڈیا کے مابین تعلقات کیسے ہوں گے تو انہوں نے کہا کہ ان کے مابین تعلقات ایسے ہی ہوں گے جیسے کینیڈا اور امریکہ (USA) کے مابین ہیں۔ لیکن جو کچھ ہوا وہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ اس کی وجہ یہی کشمیر کی ہڈی ہے جو بے ایمان انگریز ہمارے مابین ڈال کر گیا ہے۔ دشمنی تو اُس قوم سے ہوتی ہے جو حکمران رہی ہو' اور انگریز اگر دو سو برس نہیں تو کم سے کم سو برس تو ہندوستان پر براہ راست حکمران رہا ہے۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک تاجِ برطانیہ نے ہم پر حکومت کی ہے' ورنہ اصل میں تو ۱۷۵۷ء میں جنگِ پلاسی سے انگریز کی حکمرانی شروع ہو گئی تھی۔ اس اعتبار سے انہوں نے ۱۹۰ برس حکومت کی ہے۔ اس حوالے سے دشمنی تو انگریز سے ہونی چاہئے تھی' لیکن نہ ہمیں انگریز سے دشمنی ہوئی نہ بھارتیوں کو' بلکہ ہماری ساری دشمنی آپس میں ہے۔ دشمنی کے سارے جذبات ہم نے ایک دوسرے میں neutralize کر لئے اور انگریز ہی کے تھیلے کے اندر ہماری بلّی بھی رہی اور ان کی بلّی بھی۔

عالمِ اسلام میں پاکستان کا امتیازی مقام

اب میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اُمّتِ مسلمہ کا بحیثیتِ اُمّت اصل مقابلہ یہود سے ہے۔ یہ پوری اُمّت کا معاملہ ہے' جبکہ بھارت کا مقابلہ تنہا پاکستان کا معاملہ ہے۔ اس اعتبار سے نوٹ کیجئے کہ ان دونوں میں dimension اور حجم کا فرق ہے۔ وہ معاملہ پوری امت کا ہے' یعنی موجودہ اُمّتِ مسلمہ بمقابلہ سابقہ معزول شدہ اُمّتِ مسلمہ۔ بنی اسرائیل بھی امت مسلمہ تھے' لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد معزول کر دیئے

گئے۔ چنانچہ یہ اب تک مسلمانوں کے خلاف حسد میں پیچ و تاب کھا رہے ہیں۔ ان کی ساری دشمنی حضور ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف ہے کہ وہ مقام جو ہمارا تھا ان کو مل گیا۔ قرآن مجید میں ان کے بارے میں آیا ہے : ﴿ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ ﴾ یعنی اپنے نفس کے حسد کی وجہ سے اسلام اور مسلمانوں سے دشمنی ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے۔ اس معاملے میں اُمّتِ مسلمہ کی قیادت کا منصب اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو عطا کیا ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ہم بھٹک گئے ہیں اور قیامِ پاکستان کے مقصد ہی کو فراموش کر بیٹھے ہیں۔ میں نے اپنی کتاب "استحکامِ پاکستان" میں پاکستان کا پورا پس منظر بیان کیا ہے۔ پاکستان کا قیام ایک معجزہ ہے۔ پھر یہاں "قراردادِ مقاصد" پاس ہوئی جس کی نظیر دنیا میں کہیں اور نہیں ملتی۔ اصولی اعتبار سے ہم ۱۹۴۹ء میں قیامِ خلافت کا اعلان کر چکے ہیں۔ ہم نے گویا اپنے ہاتھ کاٹ دیئے ہیں اور حاکمیت کا اختیار ہم اللہ تعالیٰ کے لئے مان چکے ہیں۔ ہم یہ اقرار کر چکے ہیں کہ حاکمیت مطلقہ تو اللہ کی ہے اور ہمارے پاس کوئی اختیار نہیں ہے۔ پھر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایٹمی صلاحیت عطا کر دی۔ چیچنیا کے سابق صدر زیلم خان صاحب کا سب سے بڑا "جرم" یہی تو ہے جس کی وجہ سے انہیں ہماری حکومت نے پاکستان سے نکالنے کا فیصلہ کر لیا ہے کہ انہوں نے اپنے خطابات میں بار بار کہا ہے کہ پاکستان کی ایٹمی صلاحیت صرف پاکستان ہی کی نہیں ہے بلکہ پوری اُمّتِ مسلمہ اور پورے عالمِ اسلام کی امانت ہے۔ یہی بات میں نے بارہا بیان کی ہے۔ یہ تو حکمِ خداوندی ہے ﴿ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ "تم ان کے مقابلہ کے لئے جہاں تک تمہارا بس چلے تیاری کرو"۔ چنانچہ از روئے دین ہم اس پر کسی قسم کی پابندی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ لیکن خاص طور پر اس اعتبار سے بھی ہم اس سے دست کش نہیں ہو سکتے کہ یہ صرف ہماری شے نہیں ہے' یہ تو اللہ تعالیٰ نے اُمّتِ مسلمہ کے امام کی حیثیت سے ہمیں ودیعت کی ہے۔ اس لئے کہ درحقیقت اسلام کی عملی تنفیذ آج کی ذہنی سطح پر' روحِ عصر کے مطابق صرف پاکستان ہی میں ہو سکتی ہے۔ ویسے تو افغانستان میں اسلامی احکام نافذ ہو رہے ہیں' نائیجیریا میں اسلامی شریعت کا نفاذ ہو رہا ہے' لیکن واقعہ یہ ہے کہ آج کی ذہنی سطح پر اسلام کا پیش کیا جانا اور آج کے سماجی ارتقاء (Social Evolution) کی سطح پر اسلامی نظامِ خلافت کے قیام کا

معاملہ اگر کہیں ممکن ہے تو صرف اور صرف پاکستان میں ہے۔ اس حوالے سے پاکستان کی بہت بڑی اہمیت ہے اور ہمارے کاندھوں پر بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ چنانچہ ہمیں سی ٹی بی ٹی کو ہرگز قبول نہیں کرنا چاہئے۔ تاہم اگر ہمارے پاس اس پر دستخط کرنے کے سوا کوئی چارانہ رہے تو ہمیں اپنی کچھ ناگزیر شرائط ضرور منوالینی چاہئیں۔ آج ہی کے نوائے وقت میں سلطان بشیرالدین محمود صاحب کا مضمون چھپا ہے جس میں انہوں نے اس ضمن میں کچھ شرطیں بیان کی ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ :

"اگر پاکستان کے پاس دستخط کرنے کے علاوہ کوئی راستہ نہ رہے تو پھر کم از کم درج ذیل شرائط کا منوانا ضروری ہے :

① میثاقِ ہذا میں ترمیم کی جائے' جس کی رو سے جوہری بارود کا اپنی سرحدوں کے اندر امن و سلامتی کے لئے استعمال جائز ہو۔

② این پی ٹی میں ضروری ترمیم کی جائے' تاکہ ۱۹۶۷ء والا تجربات کا "نقطۂ اختتام" معاہدے سے خارج ہو جائے۔ پاکستان کو ایٹمی قوت تسلیم کیا جائے' تاکہ ہمیں ہتھیاروں کی جانچ پڑتال کا استحقاق ہو اور ساری سہولتیں حاصل ہوں۔ مغرب سے نیوکلیئر ٹیکنالوجی کی منتقلی پر جو پابندیاں ہیں وہ اُٹھائی جائیں۔

③ قرضے کے سلسلے میں گفت و شنید' ری شیڈولنگ یا خاتمہ ہمیں منظور ہے' تاکہ قرضے کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہماری معیشت کو سہارا مل سکے۔ سپر طاقتیں مسئلہ کشمیر کو اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کے مطابق حل کرنے پر رضامندی کا اظہار کریں۔

④ "نیوکلیئر سپلائر گائیڈ لائن" کے مندرجات کا مکمل خاتمہ کیا جائے اور نیوکلیئر ٹیکنالوجی کا استعمال برائے امن اور پاور پلانٹس جائز قرار دیا جائے"۔

سلطان بشیرالدین محمود کو میں نے "شہیدِ سی ٹی بی ٹی" کا خطاب دیا ہوا ہے۔ اس لئے کہ انہیں سی ٹی بی ٹی پر اپنے سخت موقف کی وجہ سے سرکاری ملازمت چھوڑنا پڑی۔ اب وہ ایک پرائیویٹ فرم میں ملازمت کر رہے ہیں' جبکہ پہلے ایٹمی توانائی کمیشن کے اندر بہت اونچی پوسٹ پر تھے۔ ظاہر بات ہے انہوں نے بڑی قربانی دی ہے۔ انہوں نے سی ٹی بی ٹی کے بارے میں اپنا موقف بھرپور دلائل کے ساتھ ڈٹ کر بیان کیا ہے۔ لیکن چونکہ وہ

سرکاری ملازم تھے لہٰذا یہ چیز اُن کے خلاف فردِ جرم بن گئی۔

عالمِ عیسایت پر یہود کا قبضہ —— ایک تجزیہ

بہرحال اس وقت میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہودی عالمِ عیسائیت پر قبضہ کر چکے ہیں۔ عالم عیسائیت کے تین حصے ہیں۔ پہلا حصّہ واسپ (WASP) تو سب سے پہلے سو فیصد ہی یہودیوں کے ہاتھ میں آ گیا تھا' یعنی White Anglo Saxon Protestants اس لئے کہ پروٹسٹنٹ مذہب ہی یہودیوں کی ایجاد ہے۔ دوسرے یہ کہ اب انہوں نے کیتھولک بھی فتح کر لئے ہیں۔ پوپ نے ان کو حضرت مسیح علیہ السلام کو صلیب دینے کے الزام سے بھی بری کر دیا ہے اور یروشلم کو ان کا دارالخلافہ بھی تسلیم کر لیا ہے۔

عیسائیوں میں ایک تیسرا عنصر آرتھوڈوکس چرچ کا ہے۔ ان کے بارے میں میرے علم میں ایک نئی بات آئی ہے اور ہندوستان ہی سے آئی ہے۔ ہندوستان میں ایک مفکر اور دانشور اسرار عالم صاحب ہیں۔ اس وقت عالمی سطح پر جو بھی سازشیں ہو رہی ہیں' خاص طور پر یہود کی سازشیں' اس پر وہ ایک اتھارٹی مانے جاتے ہیں اور انہوں نے ان موضوعات پر کئی کتابیں بھی لکھی ہیں۔ انہوں نے اپنی ایک نئی کتاب میں لکھا ہے کہ عیسائیوں میں ایک تیسرا عنصر Orthodox Church کا ہے' جو Greek Orthodox' Russian Orthodox اور Serbian Orthodox پر مشتمل ہے۔ یہ آرتھوڈوکس عیسائی ابھی تک پورے طور پر یہود کے پنجے میں نہیں آئے۔ چنانچہ بلقان کے علاقے میں جو کچھ ہو رہا ہے' یعنی بوسنیا میں پہلے مسلمانوں کا قتلِ عام کروایا گیا' پھر اپنی فوج لے کر آ گئے اور کسی درجے میں صلح کروائی' پھر کوسوو کے اندر مسلمانوں کا خوب قتل عام کروایا' اس کے بعد بہت بڑی فورس آ گئی' اسرار عالم صاحب کا کہنا یہ ہے کہ یہ دراصل آنے والی جنگ (Armegaddon) کے لئے تیاری ہو رہی ہے' اور اس میں نہ صرف بلقان کے علاقے میں مسلمانوں کی قوت کو کچلنا مقصود ہے بلکہ آرتھوڈوکس چرچ کو بھی کچلنا مقصود ہے' اس لئے کہ یہ ابھی یہودیوں کے پورے کنٹرول

میں نہیں آ سکے۔ لہٰذا ان کے پیش نظر کیا ہے؟ چونکہ بڑی جنگ جو ہونی ہے تو وہ مشرقِ وسطیٰ میں ہونی ہے' اس کا Flash Point یروشلم ہے' وہاں مسجدِ اقصیٰ گرائی جائے گی اور وہیں پر قبۃ الصخرۃ (Dome of the Rock) گرایا جائے گا اور اس کے بعد ایک بہت بڑا دھماکہ ہو گا۔ یہ جنگ وہیں ہونی ہے۔ اصل میں دونوں طرف سے عیسائی طاقتیں قریب تر ہونے کے لئے اس علاقے کو گھیر رہی ہیں۔ فلپائن میں امریکہ کے جو اڈے تھے وہ اس نے ڈیگو گارشیا (Deigogarcia) میں منتقل کر دیئے ہیں' جو بحیرۂ عرب کے اندر ہے۔ اس لئے کہ فلپائن سے یہاں تک آنا بہت مشکل ہے اور ڈیگو گارشیا سے مشرقِ وسطیٰ پہنچنا بہت آسان ہے۔

اسی طرح نیٹو (NATO) کا سب سے بڑا مرکز جرمنی میں تھا' اسے یہ وہاں سے شفٹ کر کے بلقان میں لے آئے ہیں' اور اب وہاں مختلف ممالک کی تازہ دم فوجیں جمع ہو رہی ہیں۔ بی بی سی کے مطابق فرانس نے کہا ہے کہ اتنی فوج ہم اور بھیج دیں گے۔ اِس طرح "کفر" (KFOR) اس علاقے کے بہت قریب آ گیا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ دجّال کے ماتھے پر "ک ف ر" لکھا ہو گا۔ اور امر واقعہ یہ ہے کہ یہ لفظ ایک "O" کے اضافے کے ساتھ (KFOR) ان کے ٹینکوں کے اوپر بھی لکھا ہوا ہے اور ہوائی جہازوں کے اوپر بھی۔ اس پورے کے پورے اڈے کو بلقان میں لایا جا رہا ہے۔ بلقان ترکی کے گویا سر پر بیٹھا ہوا ہے' اور درحقیقت بلقان کا سارا علاقہ ترکوں کا تھا۔ یہ سب اس لئے کیا جا رہا ہے کہ وہ جنگیں جو ہونے والی ہیں ان کے اندر عالم عرب اور عالم اسلام کا گھیرا دونوں طرف سے قریب آ کر تنگ کیا جا سکے۔ یہ ہے جو ساری کارروائی ہو رہی ہے اور یہ ہے جو اسرار عالم صاحب نے بات کہی ہے۔ میرا ذہن ادھر نہیں گیا تھا۔

آج میں سوچ رہا تھا کہ پاکستان کے علماء نے سیاست کا میدان اختیار کر کے عقل و دانش' مطالعہ' تصنیف و تالیف وغیرہ کا کام چھوڑ دیا ہے۔ یہ کام بھارت میں ہو رہا ہے اور وہاں بڑے بڑے ادارے کام کر رہے ہیں۔ ہمارا تو حال یہ ہے کہ جیسے بلی کو چھیچھڑے نظر آئیں تو وہ ادھر لپکتی ہے' اسی طرح اختیار اور اقتدار کا چھیچھڑا لٹکا ہوا ہے جس پر ہماری مذہبی جماعتوں کی نظریں جمی رہتی ہیں۔ دو چار سیٹیں مل گئیں یا سینیٹر بن گئے تو اللہ اللہ خیر

سلّا۔ رہے ہمارے عوام تو وہ اکثر و بیشتر فرقوں کے اندر بٹے ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ کام یہاں نہیں ہو رہا جو وہاں ہو رہا ہے۔ اسرار عالم صاحب کی کتابیں کافی چشم کشا ہیں' اگرچہ ان کا انداز مشکل ہے اور وہ کچھ زیادہ گہرائی میں جاتے ہیں' لیکن بعض باتیں ان کی بہت صحیح ہیں۔

نوٹ کیجئے کہ جب نزولِ مسیح اور مہدی کے ظہور کا معاملہ ہو گا تو عرب کے مشرقی جانب سے فوجیں ان کی مدد کے لئے جائیں گی۔ پاکستان بھی عالمِ عرب کے مشرقی جانب ہے اور افغانستان بھی۔ لہٰذا افغانستان اور پاکستان کا ایک دوسرے کے بہت قریب ہونے کا معاملہ ضروری ہے۔

ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں کہ امریکہ کا ایک اخبار Spot light ہے۔ اس کے ۲۴ جنوری کے شمارے میں Joe Sobran کا کالم "Joe's Jolts" شائع ہوا ہے۔ اس کا عنوان ہے "America is in Israel's Hands!" مجھے یہ وہاں کے ایک ساتھی نے بھیجا ہے۔ اس کالم نگار نے نیویارک ٹائمز میں شائع ہونے والے ایک اسرائیلی کالم نگار کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس وقت اسرائیل لبنانیوں پر جو ظلم ڈھا رہا ہے اور حیلوں بہانوں سے ان پر بمباری کر کے سینکڑوں لبنانیوں کو موت کے گھاٹ اتار رہا ہے اس کی وجہ یہ ہے :

"We killed them out of a certian naive hubris. Believing with absolute certitute that now, with the White House, the Senate and much of the American media is in our hands, the lives of others do not count as much as our own"

"ہم نے انہیں ایک خاص زعم میں قتل کیا ہے۔ ہمیں اس کا پورا یقین ہو چکا ہے کہ اب وہائٹ ہاؤس' امریکی سینٹ اور بیشتر امریکی میڈیا ہماری گرفت میں ہے۔ دوسرے انسانوں کی جان کی وہ قدر و قیمت نہیں ہے جو ہماری جان کی ہے"۔

یعنی عام لوگوں کی زندگیوں کا کیا ہے' چاہے سینکڑوں مر جائیں' چیونٹیاں پاؤں تلے آ کر سینکڑوں مر جاتی ہیں مر جائیں' یہودی ایک بھی نہیں مرنا چاہئے۔ یہ ایک یہودی کی تحریر

(باقی صفحہ ۵۷ پر)

ڈاکٹر اسرار احمد

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ

○ چند یادیں ○ چند تأثرات
اور ○ ایک خواہش جو حسرت میں تبدیل ہو گئی!

(۲)

ان سطور کا عاجز اور ناچیز راقم ۱۹۴۷ء کے پُر آشوب دَور میں ڈیڑھ ماہ سے زائد عرصہ قصبہ حصار میں "محصور" رہنے، پھر چند دن نو تعمیر شدہ جیل میں قائم "کیمپ" میں مقیم رہنے، اور بالآخر بیس دن کے پُر صعوبت سفر کے بعد جب ۷ / نومبر ۱۹۴۷ء کو والدین اور بہن بھائیوں کے ہمراہ بھارتی پنجاب سے نکل کر سلیمانکی ہیڈ ورکس کے راستے اپنے خوابوں کی سرزمین پاکستان میں داخل ہوا ——— تو پورے ۳۳ برس تک پلٹ کر بھارت کی کسی مختصر "یاترا" کی نوبت بھی نہیں آئی۔ لیکن پھر اچانک جب فروری ۸۰ء میں یہ بند ٹوٹا تو اس کے بعد ع "مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں!" کے مصداق ۸۰ء تا ۹۱ء گیارہ سالوں کے دوران پورے سات بار بھارت جانا ہوا۔ اور بھارت کے شمالی اور جنوبی دونوں علاقوں کی مفصّل سیر کا موقع ملا ——— اس کے بعد دوبارہ ایسی بندش لگی (انڈین ہائی کمیشن نے ویزا دینا بند کر دیا) کہ اب پھر ۹ برس ہونے کو آئے ہیں کہ یہ سلسلہ بالکل منقطع ہے!

فروری ۸۰ء میں ہندوستان کے پہلے سفر کی صورت بالکل اچانک بنی۔ ہوا یہ کہ رفیق مکرم قاضی عبدالقادر صاحب (مقیم کراچی) کے حقیقی چچا زاد بھائی اور بہنوئی علی گڑھ یونیورسٹی میں ڈپٹی رجسٹرار تھے۔ ان کی جانب سے قاضی صاحب کو زور دار دعوت موصول ہوئی۔ انہوں نے مجھ سے بھی ساتھ چلنے کی درخواست کی تو میں بھی فوراً تیار ہو

گیا۔ اس لئے کہ میرے دل میں چند روز مولانا علی میاںؒ کے ساتھ گزارنے کی شدید خواہش تھی اور اس طرح اس کا ایک سنہری موقع ہاتھ آرہا تھا ـــــ اُس وقت مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ بھارت میں میرے اتنے "جاننے" اور "چاہنے" والے موجود ہیں کہ میں پندرہ روزہ ویزا کا اکثر حصّہ دہلی اور علی گڑھ میں گزارنے پر مجبور ہو جاؤں گا اور حضرت مولانا کے ساتھ صرف چوبیس گھنٹے کی مصاحبت میسّر ہوگی۔ (دہلی میں اُس وقت تک میری واقفیت یا مولانا وحید الدین خان صاحب سے تھی یا مولانا اخلاق حسین قاسمی صاحب سے!)

اس سفر میں دہلی اور علی گڑھ میں جو مصروفیات رہیں ان کی مفصّل روداد قاضی عبدالقادر صاحب ہی کے قلم سے مارچ اپریل ۱۹۸۰ء کے "میثاق" میں شائع ہو گئی تھی۔ البتہ لکھنؤ وہ میرے ساتھ نہیں جا سکے تھے (غالباً ان کے پاس وہاں کے لئے ویزا نہیں تھا!) اس لئے قیامِ لکھنؤ کی تفاصیل میری زبانی لیکن ان کے قلم سے ضبطِ تحریر میں آئیں، جو حسبِ ذیل ہیں :

"لکھنؤ میں تین دن : ڈاکٹر صاحب بذریعہ بس کانپور سے لکھنؤ پہنچے۔ تین روز کے بعد وہاں سے دہلی روانگی ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کے لکھنؤ اور دہلی کے قیام کے دوران میرا قیام کانپور اور علی گڑھ میں رہا۔ اس لئے لکھنؤ اور دہلی کی روداد جو ڈاکٹر صاحب کی زبانی معلوم ہوئی اس کا اجمالی تذکرہ درج ذیل ہے :

۱۱ فروری کی صبح لکھنؤ بس سے اتر کر ڈاکٹر صاحب سیدھے مولانا محمد منظور نعمانی صاحب مدیر "الفرقان" کی قیام گاہ تشریف لے گئے۔ مولانا نعمانی صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو لکھنؤ آنے کی دعوت دی تھی۔ مولانا سے ملاقات کر کے ڈاکٹر صاحب ندوہ تشریف لے گئے، اس لئے کہ قیام کا انتظام ندوہ میں کیا گیا تھا۔ ندوہ میں ڈاکٹر صاحب کا نہایت گرم جوشی کے ساتھ استقبال کیا گیا۔ دوپہر کا کھانا ندوہ کے تمام اساتذہ کے ساتھ مل کر کھایا۔ کچھ آرام کرنے کے بعد لکھنؤ کی سیر کی اور سی۔ آئی۔ ڈی آفس میں پاسپورٹ کا اندراج کرایا۔ ہندوستان اور پاکستان شاید دنیا کے منفرد ممالک ہیں جہاں ملک کا ویزا دینے کی بجائے شہروں کا ویزا دیا جاتا ہے۔ ایک شخص کو تین شہروں سے زیادہ کا ویزا نہیں دیا جاتا اور شہر میں آمد اور روانگی کا سی۔ آئی۔ ڈی آفس میں

اندراج ضروری ہوتا ہے۔ شام کو ڈاکٹر صاحب مولانا محمد منظور نعمانی صاحب سے ملاقات کرنے تشریف لے گئے۔ رات کا کھانا مولانا محترم کے ساتھ تناول فرمایا اور مفید گفتگو کی۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب کو ڈاکٹر صاحب کے بھارت آنے کی خبر مل چکی تھی اور وہ لکھنؤ میں ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کے لئے ٹھہرے ہوئے تھے' لیکن جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے علی گڑھ یونیورسٹی کے کینیڈی ہال کے جلسہ کی وجہ سے ایک دن کی تاخیر ہو گئی۔ مولانا علی میاں کو رائے بریلی جانا ضروری تھا اس وجہ سے وہ لکھنؤ سے تشریف لے جا چکے تھے۔ ۱۲ کی صبح ڈاکٹر صاحب مولانا علی میاں سے ملاقات کے لئے رائے بریلی تشریف لے گئے۔ ندوہ کے ناظم جناب مولانا معین اللہ صاحب ندوی بھی اس سفر میں ہمراہ تھے' جنہوں نے کار کا انتظام کیا تھا۔ مولانا ندوی کے علاوہ اس سفر میں ڈاکٹر اشتیاق احمد قریشی بھی ساتھ تھے۔ ڈاکٹر قریشی صاحب لکھنؤ کے مشہور ہومیوپیتھک معالج ہیں' دردمند دل رکھتے ہیں اور انہیں ملی و سیاسی امور میں مولانا علی میاں کے مشیر و معاون کی حیثیت حاصل ہے۔ رائے بریلی لکھنؤ سے پچاس میل دور ہے۔

رائے بریلی پہنچ کر ڈاکٹر صاحب نے مولانا علی میاں سے ملاقات کی' پرانے اور نئے امور پر سیر حاصل گفتگو کی۔ مولانا افتخار احمد فریدی صاحب مُراد آباد سے آئے ہوئے تھے ان سے بھی یہیں پر ملاقات اور تفصیلی گفتگو ہو گئی' حالانکہ ڈاکٹر صاحب کی خواہش ان سے ملاقات کے لئے مراد آباد جانے کی تھی۔ مولانا علی میاں نے بہت ہی شفقت اور محبّت کا مظاہرہ کیا۔ کوئی بیس گھنٹے ان کی معیت مین گزرے۔

رائے بریلی سے قریب کوئی ایک ڈیڑھ فرلانگ دور تکیہ شاہ عَلَمُ اللّٰہ ہے جو دریائے سئی کے کنارے ہے' ڈاکٹر صاحب وہاں تشریف لے گئے۔ بفضلہٖ تعالیٰ پانچ نمازیں یہیں پڑھیں' قبروں پر فاتحہ پڑھی۔ شاہ عَلَم اللہ صاحب نے جو سید احمد شہیدؒ کے اجداد میں سے تھے' یہاں پر خانقاہ تعمیر کی تھی۔ تین سو برس قبل یہاں جو مسجد تعمیر کی تھی وہ ابھی تک اسی نقشہ پر موجود ہے۔ اس جگہ کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ سید احمد شہیدؒ نے بیعت جہاد کے بعد یہیں سے سفر ہجرت کا آغاز کیا تھا۔ یہیں سے وہ فرزانے اٹھے جو بالاکوٹ کے میدان میں جہاد کرتے ہوئے خاک و خون میں نہائے۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدند
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را!

۱۳ فروری کو ناشتہ کے بعد مولانا علی میاں صاحب کے ہمراہ ڈاکٹر صاحب تنہا سیر کو نکلے۔ بعض باتیں رہ گئی تھیں۔ اس سیر کے دوران ڈاکٹر صاحب نے ان سے تسلّی بخش حد تک گفتگو کی۔

ساڑھے دس بجے تک واپس لکھنؤ پہنچ گئے' سیدھے ندوہ اپنی قیام گاہ پہنچے۔ دوپہر کا کھانا اساتذہ کے ساتھ کھایا۔ اساتذہ ڈاکٹر صاحب کے خطاب کے خواہش مند تھے لیکن اُن دنوں طلبہ کے امتحانات ہو رہے تھے' اس لئے خطاب نہ ہو سکا۔ تھوڑے سے وقت میں تیزی کے ساتھ ڈاکٹر صاحب نے قابل دید مقامات کا ایک چکر لگایا۔ اصغر علی' محمد علی کا عطر کا کارخانہ بھی دیکھا اور وہاں سے عطر خریدا۔ انہی کے زیر اہتمام چلنے والے مدرسہ فرقانیہ کا بھی معائنہ فرمایا۔ اس دوران ڈاکٹر اشتیاق احمد قریشی صاحب ہمراہ تھے۔ سی۔ آئی۔ ڈی آفس جاکر لکھنؤ سے واپسی کا اندراج کرایا۔

شام کو چار بجے مولانا منظور احمد صاحب نعمانی کے ساتھ وقت طے تھا۔ وہاں پہنچ کر ڈاکٹر صاحب نے مولانا محترم کے ساتھ سیر حاصل گفتگو کی۔ عالم اسلام کو درپیش دینی' سیاسی' ثقافتی اور تہذیبی مسائل زیر بحث آئے۔ جماعت اسلامی کے ماضی اور حال کے سلسلے میں گفتگو ہوئی اور مستقبل کے اندیشوں پر بھی تبادلۂ خیال ہوا۔ مولانا نعمانی صاحب سے ملاقات کر کے ڈاکٹر صاحب دہلی جانے کے لئے سیدھے اسٹیشن روانہ ہو گئے۔ لکھنؤ کا چار باغ کا ریلوے اسٹیشن برصغیر کے مشہور ترین اور خوبصورت ترین اسٹیشنوں میں سے ایک ہے۔ ڈاکٹر اشتیاق احمد صاحب یہاں بھی ساتھ تھے۔ لکھنؤ میل میں ڈاکٹر صاحب کے لئے سیٹ ریزرو تھی جس سے وہ براستہ مُراد آباد' بریلی' دہلی کے لئے روانہ ہو گئے"۔

رائے بریلی میں سب سے زیادہ گہرا تأثر جو میرے قلب و روح پر ثبت ہوا وہ تکیہ شاہ عَلَمُ اللہؒ کی روحانی اور روح پرور فضا کا تھا۔ مولانا علی میاںؒ سے جو ملاقاتیں ۱۹۶۲ء تا ۱۹۷۸ء ہو چکی تھیں (جن کا ذکر گزشتہ شمارے میں ہو چکا ہے) ان کی بنا پر یہ رائے تو میری قائم ہو چکی تھی کہ مولانا شرافت کا نادر مجسّمہ' تقویٰ اور تدیّن کا حسین پیکر' اور روحانیت کی روشن مشعل ہیں۔ چنانچہ میں اپنے اکثر احباب سے مولانا کا تذکرہ کرتے ہوئے انہیں

نیکی کا "POWER PACK" قرار دیتا رہا ہوں۔ لیکن رائے بریلی جا کر دفعتاً یہ راز کھلا کہ ان اوصافِ حمیدہ و جلیلہ کا اصل پس منظر دائرہ شاہ علم اللہؒ کا ماحول ہے! اس کے بعد سے جب بھی مولانا علی میاںؒ کا تصور میرے ذہن میں آیا' اس کے ساتھ ہی گورو بابا نانک کی وہ تصویر بھی ذہن میں لازماً آئی جو اپنے ہائی اسکول کے زمانے میں بے شمار مرتبہ نگاہ سے گزری تھی' جس میں بابا نانک کے سر کے پیچھے لازماً سورج چمکتا ہوا دکھایا جاتا تھا ـــــ چنانچہ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مولانا کی پشت پر تین سو سال کی دینی' علمی اور سب سے بڑھ کر روحانی "روایات" کا پس منظر ایک درخشاں سورج کے مانند موجود ہے ـــــ اور تین سو سال بھی وہ جن کے آغاز میں شاہ علم اللہؒ کی عظیم شخصیت تھی' اور عین درمیان میں یعنی اُس وقت (۱۹۸۰ء) کے حساب سے ڈیڑھ سو سال قبل مجاہد شہید سید احمد بریلویؒ کی تاریخی اور تاریخ ساز شخصیت تھی' جن کی ایک بیٹی کی اولاد میں خود حضرت مولانا علی میاںؒ تھے ـــــ!

میں نے اس روح پرور فضا میں پورے چوبیس گھنٹے بسر کئے اور پوری پانچ نمازیں اس مسجد میں ادا کیں جس کی چھت میں تو کچھ تبدیلی ہوئی ہے لیکن بنیادیں اور دیواریں وہی ہیں جن پر تین سو سال قبل شاہ علم اللہؒ نے اسے تعمیر کیا تھا ـــــ

اس دوران میں جس قدر شفقت مولانا نے اس عاجز اور ناچیز پر فرمائی اس کو الفاظ میں بیان کرنا تو ممکن نہیں ہے' البتہ اس کی خنک یاد میرے قلب و ذہن کی گہرائیوں میں آج تک محفوظ ہے۔ تین بار دسترخوان پر بھی رفاقت نصیب ہوئی۔ مولانا اہتمام کے ساتھ مجھے اپنے بالکل برابر بٹھاتے تھے ـــــ اور اِدھر اُدھر سے اچھی اچھی بوٹیاں اور دیگر چنیدہ ماکولات میری پلیٹ میں ڈالتے رہتے تھے!

اس شفقت کا نقطۂ عروج یہ تھا کہ مولانا نے نہ صرف مجھے دعوت دی بلکہ تقریباً حکم دیا کہ اگلے ہی ماہ دار العلوم دیوبند کا جو جلسۂ تقسیم اسناد اور جشنِ صد سالہ منعقد ہو رہا ہے اس میں ضرور شرکت کرو۔ میں نے عرض بھی کیا کہ مولانا وہ تو اصلاً دار العلوم دیوبند کے فضلاء کا اجتماع ہے اور میں نہ صرف یہ کہ دیوبند کے فضلاء میں شامل نہیں بلکہ کسی بھی مدرسے سے "فارغ" نہیں' لیکن مولانا کا اصرار قائم رہا۔ اور انہوں نے فرمایا کہ میں

مولانا نعمانی سے کہہ دوں گا وہ دعوت نامہ بھجوا دیں گے ـــــ اس پر میں نے قدرے جسارت کی اور عرض کیا کہ: "پھر شرط یہ ہے کہ میں وہاں آپ کے ساتھ ہی مقیم رہوں گا!" جس کی مولانا نے توثیق فرما دی۔

لکھنؤ جاتے ہوئے تو دل میں یہ منصوبہ موجود تھا کہ مولانا سے علیحدگی میں ملاقات کا موقع ملا تو دین کے حرکی تصور کے ضمن میں کھل کر گفتگو ہو گی۔ اس لئے کہ اس دوران میں (۱۹۷۸ء میں) مولانا کی کتاب "عصرِ حاضر میں دین کی تفہیم اور تشریح" شائع ہو گئی تھی جس میں مولانا نے جماعت اسلامی سے علیحدگی کے پورے ۳۵ سال بعد مولانا مودودی مرحوم کے دینی فکر پر تنقید اور گرفت کی تھی اور میں اسے بالاستیعاب پڑھ چکا تھا ـــــ اور اگرچہ خود میں خواہ ۵۶-۱۹۵۵ء تک تو یقیناً مولانا مرحوم کے "عقیدت مندوں" میں شامل رہا تھا لیکن اس کے بعد کی رُبع صدی کے دوران مولانا کے ساتھ میرا ذہنی اور قلبی تعلق مدّ و جزر کے بہت سے ادوار سے گزر چکا تھا' جن میں سے ۶۲ء تا ۷۰ء کے آٹھ سالوں کے دوران تو میں نے ان پر نہایت تلخ تنقیدیں بھی کی تھیں اور فی الجملہ ایک نفرت کی کیفیت دل میں موجود رہی تھی ـــــ تاہم ۷۱ء کی فروری کے بعد سے صورت حال اس حد تک تبدیل ہو چکی تھی کہ نفرت ختم ہو گئی تھی اور اس کی جگہ "احسان مندی" اور بعض اسباب کی بنا پر "ہمدردی" کے جذبات دل میں پیدا ہو گئے تھے ـــــ البتہ جہاں تک "عقیدت" کا تعلق ہے ـــــ تو وہ نوعِ "حمیّت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے!" کے مصداق کُلّی طور پر رخصت ہو چکی تھی ـــــ لیکن اس سب کے باوجود میں مولانا علی میاںؒ کی متذکرہ بالا تحریر سے قطعاً متاثر نہیں ہوا تھا اور میری رائے یہ تھی کہ مولانا مودودی کے دینی فکر میں سیاست اور ریاست کی اہمیت کے ضمن میں جس "افراط" کی بنا پر عدم توازن پیدا ہوا تھا' اس کے ردِّ عمل میں مولانا وحید الدین خاں کی طرح مولانا علی میاںؒ بھی "تفریط" کا شکار ہو گئے تھے ـــــ (واضح رہے کہ نہ صرف مولانا مودودی کے فکر بلکہ بیسویں صدی عیسوی کی جملہ احیائی تحریکوں کے دینی تصورات میں جس طرح دین کی اصل روح یعنی خالص انفرادی اور باطنی سطح پر عبد و معبود کے مابین عشق و محبّت' تواضع و تذلّل اور اخبات و تضرّع کا رشتہ اجتماعیت اور تحریکیت کے بھاری بوجھ تلے

وب کر رہ گیا تھا' اس پر شدید تنقید خود میں مولانا علی میاںؒ سے پورے گیارہ سال قبل ۱۹۶۷ء میں اپنی اس تحریر میں کر چکا تھا جو بعد میں "اسلام کی نشأۃِ ثانیہ: کرنے کا اصل کام" کے عنوان سے کتابچے کی صورت میں بہت بڑے پیمانے پر شائع ہوئی۔ اور اب میری تالیف "دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر" میں ایک باب کی حیثیت سے شامل ہے!) لیکن رائے بریلی میں عملاً جو صورت پیش آئی وہ یہ تھی کہ مولانا علی میاںؒ کی نجی اور روحانیت کے "رعب" کی بنا پر میں ان کے سامنے زبان کھولنے کی جرأت نہیں کر سکا۔ خصوصاً اس لئے کہ خود انہوں نے جماعت اسلامی یا مولانا مودودی کا ذکر تک نہیں کیا۔

البتہ مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے ساتھ دو طویل ملاقاتوں میں ان مسائل پر خوب کھل کر بات ہوئی۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ خود انہوں نے میری تالیف "تحریکِ جماعتِ اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ" کی بھی کھل کر تحسین کی تھی ـــــ اور ان ملاقاتوں میں اس پر بھی زور دیا تھا کہ میں اس کے دوسرے حصّے کی تکمیل ضرور کروں (یا دش بخیر ـــــ "تحریک جماعت اسلامی" کی اشاعت کے بعد میرا ارادہ تھا کہ اس کا دوسرا حصّہ بھی تحریر کروں اور "تحریک جماعت اسلامی" کی تحریر کے بعد کے دس سالوں کے دوران' خصوصاً ماچھی گوٹھ کی "فتح عظیم" کے بعد جماعت اسلامی نے جو "نیا رنگ" اختیار کیا تھا اس پر تفصیلی تبصرہ کروں ـــــ یہ کتاب' جو حیطۂ خیال ہی میں رہی اور منصّۂ شہود پر نہ آ سکی' تین ابواب پر مشتمل ہونی تھی۔ پہلا "نقضِ غزل" یعنی جائزہ کمیٹی کی رپورٹ سے اجتماعِ ماچھی گوٹھ تک کی تاریخ جس کے نتیجے میں جماعت شکست و ریخت سے دوچار ہوئی' دوسرا "تعمیرِ نو" جس میں ان تین اساسی نظریات کا تذکرہ مقصود تھا جن پر جماعت کی نئی تعمیر ہوئی یعنی ایک قیادت کا نیا فلسفہ' دوسرے فلسفۂ حکمتِ عملی اور تیسرے جرحِ صحابہؓ ـــــ اور تیسرا "نوبت بایں جا رسید!" ـــــ جس میں جماعت اسلامی کی تحریک کی قلبِ ماہیت کے ظواہر اور مظاہر اجاگر کئے جاتے جن کی بنا پر صورت یہ بن گئی کہ ع "کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی!" ـــــ لیکن اس مجوزہ تصنیف کا ابھی پہلا ہی باب "میثاق" میں بالاقساط شائع ہو رہا تھا کہ جماعت سے ۵۸-۵۷ء میں علیحدگی اختیار

کرنے والوں کے حلقے میں "باسی کڑھی کے اُبال" کے مصداق ایک نئی تنظیم کے قیام کی تجویز زیر غور آئی ـــــ اور "بزرگوں" نے مشورہ دیا ـــــ جو میرے نزدیک "حکم" کے درجہ میں تھا کہ اب تنقید اور تخریب سے دست کش ہو کر پوری توجہ نئی تعمیر پر مرکوز کر دی جائے ـــــ چنانچہ یہ غنچہ بن کھلے ہی مرجھا کر رہ گیا! ـــــ اور بعد میں پورے تئیس برس بعد بعض حالات کے تقاضوں سے صرف باب اوّل یعنی "نقضِ غزل" کی تکمیل ہوئی جو ۱۹۹۰ء میں "تاریخ جماعت اسلامی کا ایک گمشدہ باب" کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوا!)

بہرحال مولانا نعمانی رحمہ اللہ کی ان موضوعات پر پورے شرح وبسط کے ساتھ گفتگو اور راقم الحروف کے خیالات و نظریات کی تصویب و تحسین سے ع "کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ!" کے مصداق حوصلہ پا کر راقم نے بھی خوب کھل کر بات کی اور مولانا نعمانی رحمہ اللہ اور مولانا علی میاں رحمہ اللہ دونوں سے اپنے اختلاف کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا۔

مولانا نعمانی رحمہ اللہ سے تو راقم نے یہ کہا کہ ۲/ شعبان ۱۳۶۰ھ (بمطابق ۲۶/ اگست ۱۹۴۱ء) کو جماعت اسلامی میں اس جذبہ اور جوش و خروش کے ساتھ شامل ہو کر کہ بصد گریہ و رقّت از سرِ نو کلمہ شہادت ادا کر کے گویا اپنے ایمان کی تجدید کرتے ہوئے دینی اعتبار سے ایک بالکل نئی زندگی کا آغاز کیا تھا ـــــ صرف ایک سال دو ماہ ہی کے عرصے میں یعنی شوال ۱۳۶۱ (اکتوبر ۱۹۴۲ء) ہی میں صرف اس بنا پر علیحدگی اختیار کر لینا کہ مولانا مودودی تقویٰ اور تدیّن کے اعتبار سے معیارِ مطلوب پر پورے نہیں اترتے تھے ہرگز درست نہ تھا' جبکہ اُس وقت تک انہیں نہ مولانا کی اس زوردار دعوت کی حقانیت میں کوئی شبہ پیدا ہوا تھا جس کی گھن گرج سے متاثر ہو کر وہ نہ صرف خود اُن کی جانب کھنچے چلے آئے تھے بلکہ بعض دوسرے حضرات کو بھی کھینچ لائے تھے (جن میں نمایاں ترین مثال مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم کی تھی!) ـــــ اور نہ ہی ان کے دینی فکر میں کسی کجی کا مشاہدہ ہوا تھا ـــــ خصوصاً جبکہ مولانا مودودی نے اس مقصد عظیم کی اہمیت اور فرضیت و لزوم کے پیش نظر جس کے لئے جماعت قائم ہوئی تھی یہ تین متبادل صورتیں (Options) بھی سامنے رکھ کر آپ حضرات پر حجّت قائم کر دی تھی کہ "(۱) ایک یہ کہ

میں خود استعفاء دے دیتا ہوں' میری جگہ کسی دوسرے شخص کو رہنما منتخب کر لیا جائے۔
(۲) دوسرے یہ کہ ایک شخص نہیں ملتا تو تین چار آدمی مل کر اس کام کو سنبھال لیں' اور
(۳) تیسرے یہ کہ جماعت کا یہ نظام جو ہم نے بنایا ہے اس کو توڑ دیا جائے اور ان سب لوگوں کو جو اس نصب العین کی خدمت کا عہد کر چکے ہیں آزاد چھوڑ دیا جائے کہ جس شخص کا جس پر اطمینان ہو اس سے وابستہ ہو کر کام کرے' اور جو لوگ کسی دوسرے سے مطمئن نہ ہوں مگر خود اپنے اوپر اطمینان رکھتے ہوں' وہ خود اٹھیں اور کام کریں' اور جو لوگ دوسروں سے بھی مایوس ہوں اور اپنے آپ سے بھی وہ پھر "امام مہدی" کے ظہور کا انتظار کریں!" (روداد جماعت اسلامی حصہ اوّل صفحہ ۴۲) ـــــ ان حالات میں میرے نزدیک آپ کا خاموشی کے ساتھ تین دیگر حضرات کے ساتھ جماعت سے علیحدہ ہو جانا اصولی اور منطقی اعتبار سے قطعاً صحیح نہ تھا ـــــ اور ستم بالائے ستم یہ کہ آپ کو مولانا مودودی کی ذات اور شخصیت پر جو اعتراضات تھے آپ نے ان کے اخفاء پر بھی اصرار کیا۔ حالانکہ اگر مولانا مودودی کی سیرت و کردار کی وہ خامیاں یا کوتاہیاں اس درجہ کی تھیں کہ ان کی بنا پر ان کے ساتھ کسی بھی صورت میں اشتراکِ عمل درست نہ تھا تو آپ کا فرض تھا کہ ان کا برملا اظہار کرتے تاکہ دوسرے ارکان بھی مطلع ہو جاتے اور اگر وہ بھی آپ سے متفق ہوتے تو اسی وقت جماعت سے علیحدگی اختیار کر لیتے اور ایک غلط اور ناپسندیدہ شخص کا ساتھ دے کر اس کو تقویت پہنچانے کا ذریعہ نہ بنتے۔ اس لئے کہ حدیثِ نبوی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام : ((لَایُؤْمِنُ اَحَدُکُم حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَایُحِبُّ لِنَفْسِہٖ)) کا عکس بھی لازماً صدفی صد درست ہے کہ "کسی مؤمن کے لئے یہ روا نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہ چیز پسند کرے جو خود اپنے لئے نہیں کرتا!" ـــــ الحمدللہ کہ مولانا نعمانی رحمہ اللہ نے اپنے ایک خورد کی ان تیز و تند باتوں کا برا نہیں منایا ـــــ بلکہ ایک متانت آمیز خاموشی کے ذریعے ان کی کسی نہ کسی درجہ میں توثیق ہی کر دی۔

مولانا علی میاں کی تالیف "عصرِ حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح" کے بارے میں راقم نے پہلی بات یہ عرض کی کہ "یہ ایک کمزور کتاب ہے" تو اس کی مولانا نعمانی رحمہ اللہ نے فوراً توثیق کی۔ البتہ اس "کمزوری" کی توجیہہ یہ کی کہ : "تنقید کے مؤثر اور جاندار ہونے

کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ ناقد میں تیزی و تندی بھی ہو اور جارحانہ انداز بھی' جبکہ علی میاں کے مزاج پر شرافت اور مروّت کا غلبہ ہے!" میرے نزدیک مولانا کی یہ بات بھی اگرچہ صد فی صد درست اور مبنی بر حقیقت تھی لیکن بات صرف اتنی ہرگز نہیں تھی ـــــ اوّل تو مولانا مودودی کی تالیف "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" پر تنقید کا اوّلین تقاضا یہ تھا کہ مولانا نے الٰہ' ربّ' دین اور عبادت کے جو مفاہیم عربی ادب و لغت کی رو سے معین کئے تھے' اور جن کو قرآن حکیم سے استشہادات کے ذریعے مؤکّد کیا تھا ان پر محاکمہ ہوتا اور ان کے استدلال میں اگر کوئی غلطی تھی تو اسے واضح کیا جاتا ـــــ جبکہ ایسا بالکل نہیں ہوا۔ بلکہ صرف مولانا کے انداز بیان سے پیدا ہونے والے ایک مجموعی تأثر پر تنقید کی گئی' جو ایک حد تک تو درست تھی' لیکن اس کی نشاندہی اور تصحیح کے لئے جو انداز خود مولانا علی میاں رحمہ اللہ نے اختیار کیا وہ بھی معتدل نہیں بلکہ مخالف سمت میں دوسری انتہا کو پہنچ گیا۔ چنانچہ جہاں یہ درست ہے کہ مولانا مودودی کے فکر میں دین کے سیاسی اور ریاستی پہلو کی اہمیت غیر متوازن طور پر زیادہ اجاگر ہو گئی ہے' وہاں کیا یہ بھی واقعہ نہیں ہے کہ صدیوں کے زوال و اضمحلال کے باعث امت کے سوادِ اعظم کے تصوّرات میں دین کا یہ اہم پہلو نہ صرف یہ کہ بُری طرح دب کر رہ گیا تھا بلکہ یورپی استعمار کے دوران پیدا ہونے اور پروان چڑھنے والی نسلوں میں تو یہ ہوتے ہوتے "آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل" ـــــ اور "Out of sight ـــ out of mind" کے مصداق بالکل ہی خارج از بحث ہو گیا تھا۔ اور دین عقائد و عبادات پر مستزاد صرف نکاح و طلاق اور بعض ماکولات و مشروبات کے ضمن میں حلت و حرمت کے قواعد و ضوابط پر مشتمل ہو کر رہ گیا تھا! میں نے عرض کیا کہ اس امر میں کس شک و شبہ کی گنجائش ہے کہ حدیثِ نبویؐ (احمدؒ عن نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ) کی رو سے "خلافت علیٰ منہاج النبوت" کے بعد اُمّتِ مسلمہ پر جو دو دَور "مُلْکًا عَاضًّا" اور "مُلْکًا جَبْرِیًّا" یعنی اولاً ظالم و جابر ملوکیت اور پھر مجبوری والی ملوکیت کے آئے (راقم کے نزدیک پہلی ملوکیت سے مراد مسلمانوں کی بادشاہت کا دور ہے اور دوسری سے مراد یورپ کے عیسائی بادشاہوں کی غلامی کا دور ہے۔) اس سے مولانا علی میاں رحمہ اللہ کے محبوب و ممدوح علّامہ اقبال کے اس قول کے مطابق کہ ؎ "تھا جو

ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا۔ کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر!" اُمت کی مجموعی سوچ یقیناً متأثر ہوئی۔

چنانچہ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اگرچہ اس "ملوکیت" کا عہدِ زرّیں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا دورِ حکومت تھا' اس لئے کہ خواہ وہ "خلیفہٗ راشد" نہیں تھے لیکن ﴿ أُولٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُوْنَ ﴾ (الحجرات : ۷) کا خطاب پانے والی جماعت صحابہؓ میں تو شامل تھے ـــــ لیکن ان کے عہدِ حکومت میں بھی یہ صورت پیدا ہو گئی تھی کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ : "میں نے اللہ کے رسولؐ سے علم کے دو برتن حاصل کئے تھے' ان میں سے ایک سے تو میں نے لوگوں میں خوب تقسیم کیا ہے' لیکن دوسرے کا اگر مُنہ بھی کھول دوں تو میری شہ رگ کاٹ دی جائے گی!" ـــــ واضح رہے کہ یہ روایت صحیح بخاری کی ہے اور حضرت ابو ہریرہؓ کا انتقال حضرت امیر معاویہؓ کے انتقال سے ایک سال قبل ہو گیا تھا!

پھر کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ جب حضرت حسین ابن علی رضی اللہ عنہما اور حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما ـــــ اور پھر ان کے بعد حضرت زید بن علی رحمۃ اللہ علیہما اور حضرت نفس زکیہ رحمۃ اللہ علیہ کی مساعی کی ناکامی کے بعد ملوکیت نے جسدِ ملّت میں اپنے پنجے خوب مضبوطی سے گاڑ لئے تو اُمت کے مجموعی ذھن نے اس صورتحال کو مجبوراً تسلیم کرلیا کہ اب حکومت تو "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کے مصداق ابنِ خلدونؒ کی اصطلاح میں طاقتور عصبیت کے حامل لوگوں ہی کے ہاتھ میں رہے گی اور ہمیں ہر حال میں اسی چھت کے نیچے زندگی گزارتے ہوئے خدمتِ دین کی جو بھی ممکن العمل صورتیں دستیاب ہوں ان ہی پر اکتفا کرنی ہوگی ـــــ نتیجتاً اُمت کی قیادت کی وہ توحیدی شان ختم ہو گئی جس میں دینی و سیاسی قیادت یکجا تھی' اور دین اور سیاست کی ثنویت کے دور کا آغاز ہو گیا ـــــ جس میں کچھ ہی عرصہ کے بعد رجالِ دین میں بھی "علماء" اور "صوفیاء" کے جداگانہ گروہوں کے وجود میں آنے کے نتیجے میں قیادت کی وہ "تثلیث" وجود میں آگئی جس کا مرثیہ کہا تھا حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اس شعر میں کہ ؎

وما افسد الدِّینَ اِلَّا المُلوک ‌ ‌ ‌ ‌ واَحبار سوءٍ و رھبانھا

جس کی ٹھیک ٹھیک ترجمانی کی ترجمانِ حقیقت علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں کہ ؎

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ مُلّائی و سلطانی و پیری!

اور واضح رہے کہ حضرت عبداللہ ابن مبارک تبع تابعین کے طبقے میں ہونے کی بناء پر "قرونٌ مشھودٌلھا بالخیر" سے تعلق رکھتے ہیں! ـــــ جس سے باآسانی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ مرض جو دوسری صدی ہجری کے آغاز ہی میں اس حد تک سامنے آچکا تھا اس نے ہزار بارہ سو سال گزرنے پر کیا شدت اختیار کی ہوگی!

حدیثِ نبویؐ میں مذکور ملوکیت کے دو ادوار میں سے پہلے یعنی مسلمان بادشاہوں کے دورِ میں تو پھر بھی علماء کرام قاضی، مفتی اور سرکاری خطیب ہونے کے ناطے حیثیت و وجاہت کے حامل اور عزت و احترام کے قابل ہوتے تھے، ملوکیت کے دورِ ثانی یعنی مغربی استعمار کے زمانے میں تو "قاضی جی" کا کام صرف نکاح پڑھانا، مفتی صاحبان کا کام صرف طہارت و عبادات اور نکاح و طلاق کے مسائل میں فتویٰ دینا اور خود ساختہ خطباء کی عظیم اکثریت کا کام عقائد اور مسالک کے اختلافات کو بھڑکانا رہ گیا تھا اور ائمہ مساجد کی عظیم اکثریت کی حیثیت وہ بن چکی تھی جس کی ترجمانی علامہ اقبال نے اس شعر میں کی ہے کہ :

؎ "قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے۔ اس کو کیا سمجھیں یہ بے چارے دو رکعت کے امام!" ـــــ اور یہ سمجھنا کہ اس صورت حال کا کوئی عکس عوام و خواص کے ذہن و فکر پر نہیں پڑا حد درجہ کی خوش گمانی ہی نہیں، شدید درجہ کی غلط فہمی بھی ہے ـــــ جس کا ایک نمایاں مظہر ہے وہ بات جو انگریزی حکومت کے دور میں ایک بہت بڑی دینی و روحانی شخصیت نے کہی تھی، یعنی یہ کہ : "ہمیں ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہئے جس سے ہمارے حکمرانوں کو تشویش لاحق ہو اس لئے کہ انہوں نے ہمیں "مذہبی آزادی" دی ہوئی ہے ـــــ!" جس پر یہ تلخ پھبتی چست کرنی پڑی تھی علامہ اقبال کو کہ ؎

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

الغرض یہ تھا وہ پس منظر جس میں بیسویں صدی عیسوی کی احیائی تحریکیں اٹھیں، جن

کے داعیوں میں ایک مضبوط اور مدلّل فکر کے حامل ہونے کے ناطے ایک نمایاں مقام مولانا مودودی کو حاصل ہوا ـــــ جن کے دینی فکر کی اہم اساس ان کی تالیف "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" تھی، جس کے بارے میں خود مولانا علی میاںؒ نے لکھا کہ مصر کی عظیم تحریک الاخوان المسلمون کے عظیم ترین مصنف و مفسر سید قطب اس کے "عاشق" تھے!

ساتویں صدی عیسوی یعنی دورِ نبویؐ، دورِ خلافت راشدہ اور دورِ صحابہؓ اور بیسویں صدی عیسوی کے درمیان کی بارہ صدیوں کے دوران علماء و صلحاءِ اُمّت اور خادمین و مجدّدینِ دینِ متین نے ملوکیت کی چھت کے نیچے رہنے کی مجبوری کے علی الرغم جو وقیع اور قابل قدر کارہائے نمایاں سرانجام دیئے وہ اُمّتِ مسلمہ کی تاریخ کا نہایت قابل فخر حصّہ ہیں۔ چنانچہ عوام کے عقائد و اعمال میں خرابی اور فساد کی جو صورتیں بھی پیدا ہوئیں ان کی تصحیح و اصلاح ـــــ اور خارج سے جو ملحدانہ افکار و نظریات حملہ آور ہوئے ان کی تغلیط و تردید گویا فی الجملہ ہر قسم کی گمراہی کے سدِّباب کے ضمن میں ان کی مساعی اُمّت کی اجتماعی گردن پر عظیم احسان کی حیثیت رکھتی ہیں ـــــ تاہم اسلام کے نظام سیاست و ریاست کے احیاء یا بالفاظ دیگر "خلافت علیٰ منہاجِ نبوّت" کے از سرِنو قیام کی سعی کی راہ میں ان حضرات کے سامنے دو رکاوٹیں حائل تھیں: ایک نبی اکرم ﷺ کے وہ فرمودات جن میں مسلمان حکمرانوں کے خلاف بغاوت پر یہ شرط عائد کی گئی ہے کہ وہ "کفرِبواح" یعنی صریح کفر کا حکم دیں ـــــ اور اسی ضمن میں فقہائے اسلام کا اس امر پر اجماع کہ "متغلّب" یعنی خود اپنی قوت کے بل پر حکومت پر قابض ہو جانے والے حکمران کی امامت بھی جائز ہے ـــــ اور دوسرے یہ کہ تاحال انسان کے اجتماعی شعور کا ارتقاء یعنی Social Evolution کا عمل اس مقام تک نہیں پہنچا تھا کہ "ریاست" اور "حکومت" دو جدا چیزیں ہیں، چنانچہ شہریوں کی وفاداری ریاست سے ہوتی ہے نہ کہ حکومت سے۔ حکومت کو تو بنانے اور ختم کرنے کا حق عوام کو حاصل ہے ـــــ گویا اس وقت تک "نظام" کو بدلنے کی ہر کوشش لازماً بغاوت شمار ہوتی تھی۔

یہی وجہ ہے کہ جیسے ہی اوّل الذکر رکاوٹ ختم ہوئی اور عیسائی اقوام نے مختلف

مسلمان ممالک پر حاکمانہ تسلّط حاصل کر لیا عسکری تحریکیں بھی شروع ہو گئیں جن میں سوڈان کے مہدی سوڈانیؒ' لیبیا کے سنوسیؒ' الجزائر کے عبدالقادرؒ' شیشان کے امام شاملؒ ـــــ اور خود ہندوستان میں مجاہد کبیر سید احمد بریلویؒ نے ﴿ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ ﴾ (الحدید : ۲۵) کی رہنمائی میں جہاد بالسّیف کا آغاز کر دیا ـــــ (واضح رہے کہ حضرت سید صاحب کے جہاد و قتال کا آغاز تو اگرچہ سکھوں کے خلاف ہوا تھا' لیکن ان کا اصل اور آخری ہدف انگریز تھے!) ـــــ لیکن ظاہر ہے کہ یہ صورت بھی انیسویں صدی عیسوی میں پیدا ہوئی۔ اس سے قبل کی بارہ صدیوں کے دوران تو جو صورتحال عملاً قائم رہی اس کے نتیجے میں ہرگز کوئی تعجب کی بات نہیں کہ رفتہ رفتہ دینی تصورات صرف انفرادی اور زیادہ سے زیادہ عائلی اور معاشرتی معاملات تک محدود ہوتے چلے گئے اور دین کے سیاسی و ریاستی پہلو پس منظر میں مدّھم ہوتے ہوتے تقریباً معدوم (Fade out) ہو گئے! چنانچہ الٰہ' رب' دین اور عبادت کی اساسی اصطلاحات میں سے بھی سیاسی عنصر کم ہوتے ہوتے تقریباً ختم ہو گیا۔ اگرچہ اس کمی کو ضلالت سے تعبیر کرنا ہرگز صحیح نہیں ہے (اور میرے محدود علم کی حد تک کم از کم مولانا مودودی نے ہرگز ایسا نہیں کیا!) بلکہ صرف یہ کہنا چاہئے کہ دین اور فرائضِ دینی کے تصورات محدود یا "ناقص" (واضح رہے کہ عربی میں اس کا اصل مفہوم "نامکمل" کا ہے!) ہوتے چلے گئے ـــــ اس پس منظر میں جب بیسویں صدی عیسوی کی احیائی تحریکیں برسرِ عمل ہوئیں تو وہ بھی دین کے اس دبے ہوئے پہلو کو ابھارنے اور اجاگر کرنے کی سعی میں ردِّ عمل کے جوش میں اس درجہ غیر متوازن ہو گئیں کہ دین کا تعبّدی پہلو اور اس کی باطنی ایمانی و احسانی چاشنی ختم ہو کر رہ گئی ـــــ اس صورت حال کا اصل تقاضا یہ تھا کہ اس "دعویٰ" (Thesis) اور "جوابِ دعویٰ" (Anti Thesis) کے مابین تالیف و توفیق (Synthesis) کی کوشش کی جاتی ـــــ اور واقعہ یہ ہے کہ جماعت اسلامی میں مولانا مودودی کی دعوت پر ابتداءً جو نمایاں اصحاب علم و فضل اور اہم دینی اور روحانی شخصیتیں شامل ہوئی تھیں وہ اگر اس میں شامل رہتیں تو وہ صورت ہرگز پیدا نہ ہوتی جس کا مرثیہ مولانا علی میاںؒ نے اپنی تالیف کے آخر میں ان الفاظ میں کیا ہے :

"فرقِ اسلامیہ کی تاریخ بتاتی ہے کہ ان میں سے کثیر تعداد میں وہ فرقے اور گروہ ہیں جن کی بنیاد نیک نیتی' جذبۂ اصلاح یا کسی خرابی یا جمود و غلو کو دور کرنے پر پڑی تھی' اور ان کے بانیوں نے رجوع الی الحق اور کتاب و سنّت کو صحت و خطا کی میزان اور حق کا معیار سمجھنے اور ماننے کی دعوت دی تھی' مگر ان کے پیروؤں کے اسی غلو اور شخصیت پرستی نے جو ان کے وفورِ علم' جرأتِ تنقید' یا ایثار و قربانی کی بناء پر ان میں پیدا ہو گیا تھا' اور امتدادِ زمانہ کے ساتھ بڑھتا رہا' ان کو ایک فرقہ اور گروہ بننے کے راستے پر ڈال دیا .... یہ صورت حال اس جماعت کے ساتھ زیادہ پیش آتی ہے' اور اس کا خطرہ رہتا ہے جس کا فکری و علمی اٹھان' نشوونما اور ذہنی ارتقاء ایک ہی شخصیت کے افکار و خیالات اور تحقیقات پر ہوا ہو' اور اس کی ذہنی و دینی تربیت میں کوئی اور مؤثر عنصر' شخصیت یا ادارہ شامل نہ رہا ہو .... اس جماعت کا ذہنی و علمی رشتہ جماعت سے باہر کے اہلِ اخلاص اور اہلِ خیر سے جن سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا' کمزور ہوتے ہوتے منقطع ہو گیا اور وہ جماعت اپنے ذہنی و فکری اور اپنے بانی کے پیدا کئے ہوئے لٹریچر کے خول میں زندگی گزارنے لگی' اور اگر اس جماعت میں اسی پایہ کے یا زمانہ کی ضرورت کے مطابق دوسرے اہلِ فکر یا اہلِ قلم پیدا نہیں ہوئے' تو اس کو اپنے اس ذہنی حصار میں باہر کی تازہ ہوا' تازہ افکار' کتاب و سنت سے براہ راست جدید استفادہ و استنباط کے عمل سے جس کو ہمیشہ جاری رہنا چاہئے' محرومی ہو گئی' اور پھر یہ درخت نئے برگ و بار لانے اور باہر سے شادابی اور نمو حاصل کرنے کے بجائے مرجھانے اور سوکھنے لگا ـــــ"

میں نے مولانا نعمانیؒ سے عرض کیا کہ متذکرہ بالا نمایاں دینی اور روحانی شخصیتوں میں میرے نزدیک نمایاں ترین مقام آپ دونوں حضرات کو حاصل تھا اور اگرچہ میرے علم میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے "کاش!" کے حوالے سے گفتگو کرنے سے منع فرمایا ہے (اِنَّ کلمۃَ لَو تفتَح عملَ الشَّیطان) لہٰذا میں زبان سے تو یہ کہنے سے احتراز ہی کرتا ہوں لیکن میرے لوحِ قلب پر یہ حسرت نقش ہے کہ کاش آپ حضرات جماعت سے علیحدہ نہ ہوتے! ـــــ اور مولاناؒ کا کرم کہ انہوں نے میری ساری باتیں سن لیں!

اس پر اس وقت راقم الحروف یہ اضافہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان دونوں حضرات

نے مزید زیادتی یہ کی کہ جماعت اسلامی سے علیحدگی کے بعد اپنی صلاحیتوں' قوتوں اور اوقات کو ان ہی جزوی اصلاحی' تعلیمی اور تبلیغی سرگرمیوں کے لئے وقف رکھا جن میں سابق صلحاءِ اُمّت اور مجدّدینِ دین نے ملوکیت کی مستبد چھت کے نیچے رہنے کی مجبوری کے باعث اپنے آپ کو محدود رکھا تھا ـــــ حالانکہ بیسویں صدی کے نصف اوّل میں تو سارا عالمِ اسلام مغربی استعمار کی اس چھت کے نیچے تھا جس میں حکومت تلوار کی بجائے قلم کے ذریعے ہونے لگی تھی' چنانچہ نظریاتی جماعتیں قائم کرنے پر بھی کوئی قانونی یا دستوری قدغن نہیں رہی تھی ـــــ اور انقلابی جِدّوجُہد بھی جب تک امن عامہ میں خلل نہ ڈالے اور توڑ پھوڑ اور مار دھاڑ کا راستہ اختیار نہ کرے اپنے دعوتی' تنظیمی اور تربیتی مراحل پورے قانونی و دستوری استحقاق کے ساتھ جاری رکھ سکتی تھی۔ ان حالات میں خالص توحید و رسالت کی دعوت' اور پھر اس کی بنیاد پر احادیثِ نبویہؐ : ((عَلَیْکُمْ بِالْجَمَاعَةِ)) اور ((یَدُاللّٰہِ عَلَی الْجَمَاعَةِ)) اور ان سب سے بڑھ کر : ((اٰمُرُکُمْ بِخَمْسٍ (اللّٰہُ اَمَرَنِیْ بِھِنَّ) بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْھِجْرَةِ وَالْجِھَادِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ!)) کے مطابق خالص اسلامی نظم جماعت کے قیام سے دست کش رہنے کا ہرگز کوئی جواز نہیں تھا۔ پھر اگر ایک وقت میں جب مولانا مودودی نے اس کا بیڑہ اٹھالیا تو جو لوگ ان کی دعوت پر اقامتِ دینِ حق اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کی جدوجہد کے لئے ایک جماعتی نظم میں منسلک ہوئے ان کے لئے کسی مجبوری کی بناء پر اس سے علیحدگی اختیار کرنے کی صورت میں دو کام عقلی اور منطقی اعتبار سے لازم اور لابُدّی تھے : ایک یہ کہ اپنے اختلاف کا' خواہ وہ نظریاتی ہوتا یا شخصی' ڈنکے کی چوٹ اعلان کرتے اور جماعت پر اتمامِ حجّت کے بعد ہی علیحدہ ہوتے' ـــــ اور دوسرے یہ کہ پھر خود اپنے طور پر اس کام کو جاری رکھنے کے لئے کمر کسے رکھتے! ـــــ (اور اگر اسے تعلّی پر محمول نہ کیا جائے تو عرض ہے کہ سورۂ ھُود کی آیت ۸۸ میں واردشدہ الفاظ ﴿ وَمَا اُرِیْدُ اَنْ اُخَالِفَکُمْ اِلٰی مَا اَنْھٰکُمْ عَنْہُ ﴾ کے مصداق راقم الحروف نے بحمداللہ ایسا نہیں کیا کہ جو طرزِ عمل دوسروں کے لئے تجویز کر رہا ہے اس پر خود عمل نہ کیا ہو ـــــ اس کے برعکس ۱۹۵۷ء میں جب جماعت سے علیحدگی کی نوبت آئی تو یہ مرحلہ اپنے اختلاف کے ڈنکے کی چوٹ اعلان و اظہار کے بعد آیا' اور پھر

الحمدللہ کہ ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا کہ اس مقصد سے ذہنی پسپائی اختیار کی ہو جس کے لئے جماعت میں شمولیت اختیار کی تھی۔)

خصوصاً ـــــ بیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں جبکہ پورا عالم اسلام یورپی استعمار کے شکنجے سے تو رفتہ رفتہ نجات پاگیا لیکن نہ کہیں اسلامی شریعت نافذ ہوئی نہ دینِ حق کا نظام عدل اجتماعی قائم ہوا کم از کم ان نام نہاد مسلم ممالک میں رہنے والوں کیلئے تو ازبس لازمی ہے کہ اپنے اپنے ملکوں میں نفاذ شریعت اور قیام نظام اسلامی کی سعی وجُہد کریں۔

خاص طور پر ان مسلم ممالک میں جہاں جمہوری یا نیم جمہوری دستوری ریاستیں قائم ہیں لہٰذا وہاں دستور و قانون کی حدود کے اندر رہتے ہوئے رائے عامّہ کو منظم اور mobilize کرکے حکمرانوں پر دباؤ ڈالا جاسکتا ہے کہ وہ اسلامی قانون کو رائج کریں اور ﴿لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ (الحدید : ۲۵) کے مطابق دین حق کا عادلانہ نظام قائم کریں ـــــ اور علیٰ ہٰذا القیاس بھارت ایسے ملک میں بھی جہاں کم از کم نظری طور پر اگرچہ سیکولر سرمایہ دارانہ جمہوریت کا نظام قائم ہے' تاہم نہ رام راج اور "ہندوتوا" کا نعرہ لگانے والوں پر کوئی قانونی اور دستوری قدغن ہے' نہ کمیونسٹ پارٹی پر کوئی پابندی ہے ـــــ تو آخر ایک نظام عدل وقسط کی حیثیت سے اسلام کی دعوت کو پھیلانے اور اسے قائم و نافذ کرنے کی جدّوجُہد کو کیوں ناممکن سمجھا جائے؟ ـــــ چنانچہ یہ تو یقیناً صحیح ہے کہ بعض تاریخی عوامل کے باعث اس راہ میں مشکلات بہت حائل ہیں' لیکن بہرصورت یہ کام ناممکن ہرگز نہیں!

اسی طرح اسلاف کی عزّت واحترام اور ان کی توقیر و تعظیم کا حق ادا کرنا ایک مختلف بات ہے اور یہ گمان کرنا کہ ان میں سے کسی میں کسی بھی اعتبار سے کوئی کمی یا تقصیر تھی ہی نہیں ایک بالکل دوسری بات ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ اگر اس پورے درمیانی عرصہ میں سب کچھ مثالی اور صد فی صد درست رہا تھا تو پھر امت پر زوال کیوں آیا ـــــ اور آج ہم اس حال کو کیوں پہنچے کہ ﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ کی تصویر بنے ہوئے ہیں۔ گویا وہی پرانی کہانی کہ ایک ریاضی دان کو اپنے کنبے سمیت کوئی ندی عبور کرنی تھی تو اس نے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ندی کی گہرائی ناپ کر

اس کا اوسط نکال لیا اور اس کی بنیاد پر پورے کنبے کو ندی میں اتار کر غرق کرا لیا ـــــ لیکن خود پار جا کر اپنے اعداد و شمار اور حساب کتاب کا دوبارہ جائزہ لے کر اپنے آپ سے سوال کیا کہ : "حساب میرا جوں کا توں! کنبہ میرا ڈوبا کیوں؟"

یہ بات اپنی جگہ صد فی صد درست ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ میری اُمّت کبھی ضلالت پر جمع نہیں ہو گی ـــــ اور یہ کہ میری اُمّت میں ہمیشہ ایک گروہ لازماً حق پر رہے گا۔ (اور یہ دراصل ختمِ نبوّت سے پیدا ہونے والے خلاء کو پُر کرنے کی خدائی تدبیروں میں سے ہے کہ قرآن حکیم کے متن کی حفاظت اور ہر صدی میں مجدّدین کی بعثت کی ضمانت کے ساتھ ساتھ یہ دو اضافی ضمانتیں بھی دے دی گئیں) ـــــ لیکن ایک تو یہ بھی واضح رہنا چاہئے کہ ضمانت صرف اس کی ہے کہ ہر دور میں کم از کم ایک گروہ یا جماعت حق پر قائم رہے گی ـــــ پوری اُمّت کے بحیثیتِ مجموعی حق پر قائم رہنے کی کوئی مثبت گارنٹی نہیں دی گئی۔ (پوری اُمّت کے ضلالت پر "جمع" نہ ہونے کی بشارت ایک منفی ضمانت ہے) اور اس کے ساتھ ساتھ کیا اس مضمون کی احادیث بھی موجود نہیں ہیں جن میں خبر دی گئی ہے کہ ایک زمانہ آئے گا کہ فتنہ اتنا عام ہو جائے گا کہ کوئی ایک گھر بھی اس سے محفوظ نہیں رہے گا ـــــ اور سب سے بڑھ کر یہ حدیث کہ :

((یُوْشِكُ اَنْ یَّاْتِیَ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ لَایبقٰی مِنَ الاِسلامِ اِلاَّ اسْمُه وَلا یبقٰی من القرآنِ اِلاَّ رَسْمُهٗ مَساجدُهم عامرةٌ وهی خرابٌ من الهُدٰی وعُلماءُ هم شَرُّ مَن تَحْتَ اَدِیمِ السَّمَاءِ مِن عندِهم تخرُج الفتنةُ وفیهم تَعُودُ)) (رواه البیهقیؒ عن علیؓ والحاکمؒ عن ابن عمرؓ والدیلمیؒ عن معاذؓ وابی هریرةؓ)

"لوگوں پر وہ زمانہ بھی آئے گا کہ اسلام میں اس کے نام کے سوا کچھ باقی نہ بچے گا اور قرآن میں سے اس کے رسم الخط کے سوا کچھ نہ بچے گا۔ ان کی مساجد بہت آباد ہوں گی مگر وہ ہدایت سے خالی ہوں گی۔ اور ان کے علماء آسمان کی چھت کے نیچے کی بدترین مخلوق ہوں گے، انہی میں سے فتنہ نکلے گا اور انہی میں واپس لوٹ جائے گا"۔

میں مولانا محمد منظور نعمانیؒ اور حضرت مولانا علی میاںؒ کے عقیدت مندوں اور

متوسلین سے معذرت خواہ ہوں کہ اس "خوگرِ حمد" کی زبان پر یہ گلے شکوے بھی آ گئے ـــــ لیکن انہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس نظریاتی اختلاف کے باوجود میرے دل میں ان دونوں حضرات کی محبّت و عقیدت پوری شدّت کے ساتھ موجود ہے ـــــ اس لئے کہ مجھے ان کے خلوص و اخلاص، تقویٰ و للّٰہیت اور خدمتِ دین و ملّت میں عمر بھر اپنی بہترین صلاحیتوں اور توانائیوں اور قوّات و اوقات کو وقف کئے رکھنے کا تہہ دل سے اقرار و اعتراف ہے اور بحمد اللہ اس امر کا بھی پورا شعور و ادراک حاصل ہے کہ وہ آخری دم تک سلفِ صالح کے نقشِ قدم پر قائم و دائم رہے اور کسی ذہنی اپج کی بناء پر اپنے عقیدتمندوں کو کسی نئے اور گمراہ کن نظریئے یا عقیدے کی چھوت لگائے بغیر صالحین و ابرار ہی کے عقیدہ و عمل پر دنیا سے رخصت ہو گئے۔ (۱) ـــــ اس اعتبار سے میرے نزدیک یہ دونوں بزرگ مجددینِ اُمّت کے اسی قافلے کے مسافروں میں سے تھے جن کی تجدیدی مساعی کو مولانا مودودی نے "جزوی تجدید" قرار دیا ہے اور جس کے چودھویں صدی ہجری کے سرخیل اور قافلہ سالار شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ تھے ـــــ یہ دوسری بات ہے کہ راقم الحروف کے نزدیک چودھویں صدی ہجری اُس "تجدیدِ کامل" کی تمہید کی صدی تھی جس کا نتیجہ، اُسی حدیثِ نبویؐ کی رو سے جس کا حوالہ پہلے آ چکا ہے، (احمدؒ عن نعمان ابن بشیرؓ) "ثم تکون خلافة علیٰ منهاج النبوة" کی صورت میں نکلے گا ـــــ اور اگرچہ اس صدی کی احیائی اور تجدیدی مساعی میں سے بعض میں عقیدے اور نظریئے کی کجی بھی در آئی اور عملی اقدامات کے ضمن میں تو ان سے بہت بڑی

---

(۱) بخلاف مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے، کہ دونوں نے اپنی حیاتِ دُنیوی کے آخری دور میں بعض ناپسندیدہ کمائیاں کیں اور انہیں اپنے اپنے معتقدین کے لئے ایک برے ورثہ کے طور پر چھوڑ گئے ـــــ ہماری مراد مولانا مودودی کے فلسفۂ حکمت عملی کی صورت جدید "بالغیت" اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے مرتبہ و مقام کا بحیثیت مجموعی استخفاف اور بعض پر باضابطہ طعن اور جرح و قدح ـــــ اور مولانا اصلاحی کے حدِ رجم کے ضمن میں امت کے اجماع سے انحراف اور منکرینِ حدیث کی ہمنوائی سے ہے! اللہ ان حضرات کی خطاؤں سے درگزر فرمائے اور انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے، آمین!

بڑی غلطیاں سرزد ہوئیں ـــــ تاہم ان سب کی مساعی کے حاصل جمع کے نتیجے میں قافلۂ تجدید و احیائے دین ﴿لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ﴾ کے مصداق درجہ بدرجہ آگے بڑھ رہا ہے ـــــ اور ان شاء اللہ العزیز پندرہویں صدی کے وسط تک یہ قافلہ ع "شکر صد شکر کہ جمّازہ بمنزل رسید!" کے مصداق کُل روئے ارضی کو محیط نظامِ خلافت علیٰ منہاج النّبوت کی منزل تک پہنچ جائے گا ـــــ اور مجھے ان دونوں بزرگوں کے ضمن میں افسوس ہے تو صرف اس کا کہ انہیں ایک ایسی دعوت اور تحریک سے تعارف بھی حاصل ہوا اور اس میں شرکت کی سعادت بھی نصیب ہوئی جو الفاظِ قرآنی ﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا﴾ (المائدہ : ۴۸) کے مطابق خالص منہاجِ محمدی علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسلام پر دین کی کُلّی تجدید کے لئے برپا ہوئی تھی۔ لیکن پھر انہوں نے جلد ہی اس سے علیحدگی اختیار کرلی جس کے نتیجے میں وہ تحریک ان کے اس کردار سے محروم ہوگئی جو اسے صحیح سمت میں آگے بڑھانے اور کارکنوں میں صحیح دینی مزاج پروان چڑھانے کے ضمن میں وہ بھرپور طور پر ادا کرسکتے تھے!

ساتھ ہی ہم ان دونوں بزرگوں کے متوسّلین اور مُنتسبین سے یہ گزارش کرنے کی جسارت بھی کررہے ہیں کہ وہ ان دونوں حضرات کی جماعت اسلامی میں عارضی شمولیت کو خواہ کتنا بھی ناپسند کرتے ہوں ایک واقعے کے اعتبار سے اس کا اخفاء ہرگز مناسب نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا علی میاںؒ کی رحلت کی مناسبت سے جو اشاعت خصوصی ماہنامہ "الفرقان" کی موصول ہوئی ہے اس میں جناب یحییٰ نعمانی (جو غالباً مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے پوتے ہوں گے) کی جو تحریر شائع ہوئی ہے اس کے یہ الفاظ قابل توجہ ہیں :

> "مولانا نے اپنی تصنیفی زندگی کی ابتدا تحریکِ تجدید ایمان و جہاد کے قافلہ سالار حضرت سید احمد شہیدؒ کی سوانح سے کی۔ کتاب مولانا محمد منظور نعمانیؒ کو بھی بھیجی۔ اس مردِ خدا کو بھی اس فضا نے وہی درد و سوز اور عزائم کی وہی سوغات دی تھی جو مولانا علی میاں کو ملی تھی۔ کتاب پڑھنے کے بعد انہوں نے مولانا کو لکھا کہ اب کچھ کرنا بھی ہے یا صرف کتاب لکھ دی ہے۔ پھر دونوں جواں سال و جواں ہمت بزرگوں کی ملاقات ہوئی اور دونوں نے نصرتِ دین کی ایک جامع اور احیاء و تجدید کے کسی متوازن عملی

نظام کی تلاش میں ملک کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا۔ اور دونوں نے ایک ایسے طریقہ کار کا انتخاب کرلیا جو اُس وقت ان کے نزدیک اپنے مقاصد و انداز کے لحاظ سے ان کی تمناؤں اور آرزوؤں کی تلاش تھا۔ پھر یہی مقاصد اور احیاء و تجدیدِ دین کی یہی تمنا دونوں بزرگوں کو حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے درِ دولت پر لے آئی، جہاں ان کے دل کی پیاس بھی بجھی اور ان کے مجتہدانہ دماغ کو عملی کام کا راستہ بھی نظر آیا۔

یہ زمانہ ۱۹۴۲ ۱۹۴۳ء کا ہے اور یہیں سے مولانا کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔"

اس عبارت میں جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کے ذکر کو اسی روایتی انداز میں چھپایا گیا ہے جس میں ایک کنواری لڑکی اپنے ایّام کو چھپاتی ہے ــــ (اور قابلِ صد احترام علماء کرام کے حلقے میں یہ پہلی مثال نہیں ہے۔ اس سے قبل حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی وارث جمعیت علماء ہند یہی معاملہ اپنے ہی استاذ اور شیخ کی اس تجویز کے ضمن میں کرچکی ہے جو ۱۹۲۰ء کے سالانہ اجلاس کے موقع پر سامنے آئی تھی کہ مولانا مودودی مرحوم کے مرشدِ معنوی مولانا ابوالکلام آزاد کو "امام الہند" تسلیم کرتے ہوئے ان کے ہاتھ پر بیعت کی جائے۔ اس پر ہم سوائے اس کے اور کیا عرض کرسکتے ہیں کہ ع
"ایں حال نیست صوفی عالی مقام را!!")

بہرحال اپنی جگہ راقم الحروف اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے کہ اگرچہ خاص اس موضوع پر جس کے ضمن میں اس وقت کسی قدر وضاحت سے گفتگو ہوئی راقم کے خیالات و احساسات ہمیشہ سے یہی تھے جو آج نوکِ قلم سے ٹپک پڑے ہیں، لیکن ان کی بناء پر اس کے قلب میں ان دونوں حضرات سے بالعموم اور مولانا علی میاںؒ سے بالخصوص محبّت و عقیدت میں کبھی کوئی کمی نہیں آئی۔ چنانچہ میرے یہ احساسات اُس وقت بھی موجود تھے جب ۱۹۶۲ء میں مکّہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں مولانا علی میاںؒ سے طویل صحبتیں رہیں اور اُس وقت بھی تھے جب حضرت مولاناؒ ۱۹۷۷ء اور ۱۹۷۸ء میں دوبار راقم کے غریب خانے پر تشریف لائے ــــ اور اُس وقت بھی تھے جب راقم ۱۹۸۰ء میں رائے بریلی

حاضر ہوا (اور پھر دوسری بار ۱۹۸۹ء میں وہاں دوبارہ حاضری دی!) الغرض' یہ درد بھری حسرت اپنی جگہ' اور ان کا ادب و احترام اور محبت و عقیدت اپنی جگہ۔ اس لئے کہ میرا حال فی الواقع یہ ہے کہ ؎

أحِبُّ الصَّالحينَ ولستُ منهم
لعلَّ اللّٰه يرزقني صلاحًا

پورے ۳۳ برس کے انقطاع کے بعد بھارت کی اس پہلی "یاترا" کا ضمیمہ اس سے واپسی کے چند ہی دنوں بعد حضرت مولانا علی میاںؒ کے حکم کی تعمیل میں دار العلوم دیوبند کے جشنِ صد سالہ کے لئے شدِّ رحال کی صورت میں سامنے آیا۔ لیکن افسوس کہ اس موقع پر ایک روزہ قیام بھی سخت پریشانی اور کوفت کا موجب ہوا۔ ایک جانب انسانوں کا ایک جمِ غفیر اور ناقابلِ تصور اژدھامِ عظیم' پھر اس پر بد نظمی اور سوءِ انتظام' چنانچہ ایک افراتفری ـــــ اور خاص طور پر میرے لئے کسمپرسی کا عالم! اس لئے کہ میری وہاں نہ کسی سے جان تھی نہ پہچان' اور پاکستان سے جانے والے حضرات پہچانتے بھی تھے تو وہ خود بھی نفسی نفسی کے عالم سے دوچار تھے ـــــ ادھر حضرت مولانا علی میاںؒ کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ تشریف ہی نہیں لائے! ـــــ پھر ایک عجیب کشیدگی اور کشاکش کی فضا چھائی ہوئی تھی' اس لئے کہ دو حلقوں میں دار العلوم پر بالادستی کے حصول کے لئے مقابلہ جاری تھا اور اس وقت اس ضمن میں مسابقت عروج پر تھی۔ چنانچہ ایک جانب حضرت مولانا قاری طیبؒ اور ان کے خلف الرشید مولانا محمد سالم صاحب تھے ـــــ اور دوسری جانب مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے فرزند ارجمند مولانا اسعد مدنی صاحب اور ان کے حواری! پھر مزید تکدّر اس اطلاع سے ہوا کہ افتتاحی اجلاس میں شرکت کے لئے شریمتی اندرا گاندھی تشریف لا رہی ہیں۔ اس ضمن میں پہلے تو معلوم ہوا کہ وہ از خود زبردستی آ رہی ہیں جس پر یہ خیال ہوا کہ یہ بھارتی مسلمانوں کی مجبوری ہے کہ اسے برداشت کریں ـــــ مگر بعد میں یہ معلوم کر کے شدید صدمہ ہوا کہ اس کے لئے مہتمم حضرات کا ایک وفد خصوصی دعوت دینے شریمتی جی کی خدمت میں حاضر ہوا تھا ـــــ کہ مدِّ مقابل تو ظاہر ہے

کہ پہلے ہی سے کانگریس کے سیاسی حلیف تھے' ہم بھی اپنی نیازمندی کا ثبوت دے آئیں کہ "ہم بھی ہیں سرکار کے!" ـــــ ان حالات و کیفیات کا نقطۂ عروج (Climax) اس وقت سامنے آیا جب نمازِ جمعہ کے بعد افتتاحی اجلاس میں شرکت کے لئے شریمتی اندرا گاندھی تشریف لائیں تو مولانا سالم صاحب نے سٹیج سے "اندرا گاندھی زندہ باد!" کا نعرہ لگوایا ـــــ جس پر میں فوراً جلسے سے اٹھا اور قیام گاہ پر آکر اس چارپائی پر سے جس کا حصول اُس وقت کے معروضی حالات میں ایک بہت بڑی کامیابی تھی' اپنا بستر گول کیا ـــــ اور واپسی کے لئے اسٹیشن کی جانب روانہ ہو گیا ـــــ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ اندرا گاندھی کے رخصت ہو جانے کے بعد مولانا علی میاںؒ بھی دیو بند پہنچ گئے تھے ـــــ لیکن اب ایک تو ع "بلبل نے آشیانہ چمن سے اٹھا لیا!" والی بات ہو چکی تھی' اور دوسرے وہاں یہ مشاہدہ ہو چکا تھا کہ "اکابرین" کی حفاظت کے لئے پہریداروں کی قطار اندر قطار متعدد فصلیں حائل ہیں جنہیں عبور کر کے حضرت مولاناؒ تک رسائی "لانا ہے جوئے شیر کا" سے کسی طرح کم نہیں! ـــــ لہٰذا راقم نے واپسی ہی کی راہ اختیار کی! (جاری ہے!)

بقیہ : تذکرہ و تبصرہ

ہے۔ وہ خود کہہ رہے ہیں کہ وائٹ ہاؤس بھی ہمارے ہاتھ میں ہے' سینٹ بھی ہماری مٹھی میں ہے اور میڈیا کا بھی بڑا حصہ ہماری گرفت میں ہے۔

بہرحال اس صورت حال میں جو کچھ ہمیں کرنا چاہئے اس پر میں تفصیل سے پوری کتاب "سابقہ اور موجودہ مسلمان امتوں کا ماضی حال اور مستقبل" کے نام سے تحریر کر چکا ہوں۔ اسے آپ ضرور پڑھئے۔ اسی طرح میرے "خطباتِ خلافت" ہیں کہ اس دور کی ذہنی سطح کے مطابق نظامِ خلافت اگر قائم ہو سکتا ہے تو وہ صرف پاکستان میں ہو سکتا ہے' اس سے کیا مُراد ہے؟ آج اگر خلافت قائم ہو گی تو آج کی مثالی خلافت کیا ہو گی۔ یہ تفصیلات میری کتاب "خطباتِ خلافت" میں دیکھئے۔

اقول قولی ھذا و استغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المُسلمین و المُسلمات○○

اجتہاد ـــ ایک ضرورت' ایک نعمت

ـــــــ صاحبزادہ خورشید احمد گیلانی ـــــــ

کوئی صاحب فقہی و سماجی روایات کے بارے میں زیادہ حساس اور جذباتی ہوں' اور ان معاملات میں بہت STATIC اور ORTHODOX ہوں' تو مَیں ان سے پہلے ہی قدم پر معذرت خواہ ہوں' اگر انہیں یہ فکر اور خیال اچھا نہ لگے۔ اور یہ معذرت خواہی ان معنوں میں نہیں کہ جو بات میں کرنے چلا ہوں وہ کمزور' غلط یا دین و ملت کے لئے ضرر رساں ہے' بلکہ اس لئے عذر خواہ ہوں کہ جذبات کے بلوریں سانچے اور روایت پرستی کے نازک آبگینے کو ٹھیس لگنے کا اندیشہ ہے' مگر یہ بات سوچنے والی بھی ہے' کہنے والی بھی ہے اور جرأت کر کے کرنے والی بھی ہے اور وہ یہ کہ ہم ویسے تو بہت سے فکری و عملی معاملات میں بہت ہی دو رنگی اور دو عملی کا شکار ہیں' جس کے نتیجے میں ـــــ خدا اور صنم ـــــ دونوں کے وصل سے محروم ہیں' یعنی دین سے گریز اور دنیا سے محرومی کے نتائج بھگت رہے ہیں' لیکن خاص طور پر "اجتہاد" ایک ایسا موضوعِ فکر اور زاویۂ نظر ہے جس کے بارے میں ہم بہت ہی دو غلے پن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ہم اجتہاد کے قائل بھی ہیں اور اس سے غافل بھی ہیں' اجتہاد کو ناگزیر بھی سمجھتے ہیں اور اس سے گریز بھی کرتے ہیں' اس کا دروازہ بھی کھلا رکھتے ہیں اور اس میں کسی کو گھسنے کی اجازت بھی نہیں دیتے' اس کے جواز کی بات بھی کرتے ہیں اور کسی کو اس کا مجاز بھی نہیں سمجھتے' اس کی ضرورت کو تو جانتے ہیں البتہ اجازت کسی کو نہیں دیتے۔ اسی طرزِ عمل نے اسلامی دنیا کے اندر واقعہ یہ ہے کہ قانونی' فقہی اور سماجی دائروں میں بہت سی الجھنیں پیدا کر رکھی ہیں۔ اور ایک "مفکر" نے تو یہ بات کہہ کر حد ہی کر دی ہے کہ "اگر تو اجتہاد ائمہ اربعہ کی رائے کے مطابق کرنا ہے تو وہ پہلے ہو چکا ہے' اور اگر ان سب سے ہٹ کر اجتہاد ہو گا تو یہ سراسر بے دینی اور گمراہی ہے"۔

یہ قصّہ تو انہوں نے تمام کر دیا' لیکن نہ تو سماج نے ان کی بات پر اپنا سفر روک دیا ہے' نہ مسائل نے سر اٹھانا چھوڑ دیا ہے' نہ فکر نے آگے چلنے سے انکار کر دیا ہے' نہ عالمی چیلنجز نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں' نہ وقت کی لہریں تھم گئی ہیں اور نہ حالات کی کروٹیں دم توڑ گئی ہیں۔ سماج کے تقاضے برابر آگے بڑھ رہے ہیں' مسائل روز بروز اُٹھ رہے ہیں' فکر نئی نئی خلعتیں پہن رہی ہے' عالمی چیلنج نئے روپ دھار رہے ہیں' وقت کا بہاؤ تیز سے تیز تر ہو رہا ہے اور حالات نئی کروٹیں لے رہے ہیں۔ اس لئے اجتہاد پہلے بھی ضروری تھا' اور اب بھی ضروری ہے اس کی پہلے بھی اہمیت تھی اور آج بھی افادیت ہے۔ اگر اجتہادی فکر کے آگے روک لگائی گئی تو پھر مذہب پیچھے رہ جائے گا اور وقت آگے نکل جائے گا۔ کاروانِ عصر اس باب میں بہت بے رحم اور بے مروت ہے' وہ یارانِ سُست گام کا انتظار نہیں کرتا' بلکہ انہیں چھوڑ کر اور جھٹک کر آگے بڑھ جاتا ہے' اور یہی صدیوں کا تجربہ اور حاصل ہے۔

اجتہاد کو قولاً ماننے اور عملاً روک دینے کا اصل سبب کیا ہے؟ کس اندیشے کے تحت ایسا کیا گیا اور کیا جا رہا ہے؟ کس نے سب سے پہلے اجتہاد پر قدغن لگائی؟ اور اس پابندی کا اُمّت کو کیا فائدہ پہنچا؟ یہ ہنوز پردۂ راز میں ہے' لیکن ایک طرح کا اس پر خاموش اجماع ہے۔ علامہ اقبال نے بھی اپنے مقالے "الاجتہاد فی الاسلام" میں اسی حیرت اور تجسّس کا اظہار کیا ہے۔ فرماتے ہیں :

> "اس میں کوئی شک نہیں کہ اہل سنّت وجماعت نے اجتہاد کی ضرورت سے کبھی انکار نہیں کیا' لیکن جب سے مذاہبِ اربعہ قائم ہوئے ہیں عملاً اس کی اجازت بھی کبھی نہیں دی' کیونکہ انہوں نے اس پر کچھ ایسی شرائط عائد کر دی ہیں جن کا پورا ہونا مشکل کیا سرے سے محال ہے۔ یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ اس ذہنی روش کے اسباب کیا تھے جس نے قانونِ اسلام کو عملاً سرتا سر جامد بنا رکھا ہے؟"

اجتہاد کا احیاء اور اجراء میرے نزدیک آج اسلامی دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ ہے' فکری بھی اور عملی بھی' تاکہ دنیا پر واضح ہو سکے کہ دین کی تکمیل کا مقصد فکر و نظر کی تحدید نہیں' بلکہ تجدید ہے۔ قیامت تک نوع انسانی کو جو مسائل درپیش ہوں گے اسلام ان

سب کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اور اس میں ایسے اصول و معیارات موجود ہیں جنہیں بروئے کار لا کر بڑے سے بڑے اور کڑے سے کڑے مسئلے اور چیلنج سے عہدہ برآ ہوا جا سکتا ہے۔ اسلام کا ظہور قبائلی سوسائٹی میں ہوا' بعد ازاں اس کا نفوذ باقاعدہ حکومتوں میں ہوا۔ اس کے دامنِ وسعت میں عرب' یورپ' افریقہ اور ایشیا آیا۔ اسے دنیا کی مختلف اقوام نے اپنایا' گرم اور ٹھنڈے علاقوں کے لوگ' مرغزاروں اور ریگزاروں کے لوگ' پہاڑی اور میدانی علاقوں کے لوگ' مال دار اور غریب طبقوں کے لوگ' غلام اور آزاد معاشروں کے لوگ' زرعی و صنعتی زمانوں کے لوگ۔ اور ابھی نہ جانے کتنے برّاعظم دریافت ہونے ہیں؟ کتنی نسلیں وجود میں آنی ہیں؟ کتنے طبقے ظہور پذیر ہونے ہیں؟ اور کیسے کیسے مسائل پیش آنے ہیں؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ اجتہادی روح کو دفن کر کے ان معاملات کو حل کیا جا سکے گا؟

اجتہاد کے موضوع پر بہت سا لٹریچر تیار ہو چکا ہے۔ اجتہاد طلب مسائل کی بھی ایک لمبی فہرست ہے۔ ماضی کا پورا اجتہادی ذخیرہ بھی دستیاب ہے۔ ائمہ مجتہدین کی اجتہادی آراء کا ریکارڈ بھی موجود ہے۔ اس پر مزید لکھنے کی ضرورت نہیں لیکن چند سوالات قائم کرنے میں کوئی حرج نہیں' جو ذہن کو بیدار' فکر کو انگیخت اور قلم کو متحرک کر سکتے ہیں۔

۱) سوال یہ ہے کہ قرآن حکیم کے ہوتے ہوئے اور حضور ﷺ کی وفات کے چند برس بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اجتہاد کی کیوں ضرورت پیش آ گئی تھی؟ چند سالوں میں کیا تغیّر حالات واقع ہو گیا تھا؟ اب جبکہ صدیاں گزر گئی ہیں تو اجتہاد کی ضرورت کیوں محسوس نہیں ہو رہی؟

۲) حضرت امام جعفر صادق' حضرت امام مالک' حضرت امام اعظم ابو حنیفہ' حضرت امام شافعی اور حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم کو تدوینِ فقہ کی ضرورت کیونکر محسوس ہوئی اور انہوں نے اجتہادی راہ کیوں اپنائی؟

۳) ان جلیل القدر ائمہ اور اساتذہ کے فکری نچوڑ اور ذہنی کاوش کی موجودگی کے باوصف امام محمد' امام ابو یوسف اور امام زفر رحمۃ اللہ علیہم کیوں مسندِ اجتہاد پر فائز ہوئے؟

۴) قرآن حکیم اور حدیثِ نبویؐ کی کس نص سے اجتہاد کی ممانعت ثابت ہوتی ہے؟

۵) کیا دو صدیوں بعد پوری اُمّت فکری و ذہنی طور پر بانجھ ہو گئی تھی کہ اجتہاد کا دروازہ بند کرنا اور پہلے کام پر اکتفا کرنا پڑا؟

۶) کیا سارے معاملات و مسائل صرف پہلی دو صدیوں میں اُبھرے' اس کے بعد دنیا کسی برف پوش وادی میں منتقل ہو گئی تھی کہ ہر چیز اپنی جگہ پر جامد و ساکت ہو کر رہ گئی؟

۷) جو شرائط اجتہاد کے لئے رکھی گئیں کیا بعد میں کوئی ان پر پورا نہیں اُترا' حالانکہ اسلامی تاریخ میں بڑے بڑے عبقری مفسرین' شارحینِ حدیث' شہ دماغ فقہاء' ماہرینِ عمرانیات' اجل صوفیاء' متکلمینِ اسلام اور دینیات و عصریات کے نامور علماء پیدا ہوئے۔ کیا یہ سب ان شرائط سے معرّا اور منصبِ اجتہاد کے لئے نااہل تھے؟

۸) کیا روحِ اسلام اس قدر کمزور ہے کہ وہ اجتہاد کا بوجھ نہیں سہار سکتی' یا تعلیماتِ اسلام اتنی نازک ہیں کہ اجتہاد سے انہیں ٹھیس پہنچتی ہے؟

۹) کہیں ایسا تو نہیں کہ اوپر دی گئی باتوں میں سے کوئی بات بھی نہ ہو' صرف فرقہ بازی کے ذوق نے اجتہاد کی روح کو مسل اور کچل دیا ہو' کیونکہ اجتہاد کھلی بحث' کھلے ذہن اور کھلی فضا کا متقاضی ہوتا ہے۔ اگر بحث ہونے لگے' اگر ذہن کام کرنے لگیں اور اگر علمی فضا بننے لگے تو ایسے میں فرقہ واریت مرجھانا' بجھنا اور مرنا شروع ہو جاتی ہے۔ اور یہ بات فرقوں کے پابند لوگوں کے لئے ناگوار اور ناقابل برداشت تھی' اس لئے بزرگوں کی عظمت' فقہ کی حرمت اور احکام کی قطعیت کا سہارا لے کر اجتہاد کے عمل کو روک دیا گیا ہو؟

اجتہاد اسلام سے باہر کی چیز نہیں' بلکہ اس کے نصوص و احکام کا لازمہ ہے' جیسے طراوت' تازگی' نمی اور خوشبو پودے اور پھول کا لازمہ ہوتی ہے۔

۱۰) اجتہاد کا عمل رک جانے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ مصنوعی مسائل اس قدر زور و شور سے اٹھائے گئے کہ واقعی مسائل اس گرد میں دب کر رہ گئے۔ برسوں سے اب صرف یہ مسائل حل طلب رہ گئے ہیں جن پر سارا زورِ بیان و قلم صرف ہو رہا ہے اور ان کی تحقیق و تنقیح اور چھان پھٹک میں صلاحیتیں کھپ رہی ہیں' یعنی رفع

الیدین' آمین بالجہر' فاتحہ خلف الامام' تعزیہ' ذوالجناح' امامت و خلافت' موازنۂ صحابہؓ و اہل بیتؓ' سماع موتیٰ' استمداد من اولیاء اللہ' دعا بعد نماز جنازہ' تراویح کی رکعات' میلاد کی شرعی حیثیت' ایصالِ ثواب' حاضر و ناظر' نور و بشر اور علمِ غیب وغیرہ۔

اوپر کے یہ محض چند اشارے ہیں جن سے بات آگے چل سکتی ہے۔ حالانکہ صاف سی بات ہے کہ اگر قرآن و اقوال رسول ﷺ کے ہوتے ہوئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجتہاد کر سکتے ہیں' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فیصلوں کا ریکارڈ ہوتے ہوئے فقہاء کے چار یا پانچ اجتہادی مکاتبِ فکر بن سکتے ہیں' پھر ان کی علمی کاوشوں اور اجتہادی آراء کے باوجود دوسرے مجتہدین کام کر سکتے ہیں' تو یقیناً آج بھی یہ "شجرِ ممنوعہ" نہیں جس کے قریب نہ جایا جا سکے۔

مسائل یہ نہیں جن پر سارا سرمایۂ دماغ و قلم خرچ ہو رہا ہے' بلکہ بہت سے وہ اہم مسائل ہیں جو سماج کے لئے ایک چیلنج بن سکتے ہیں' یعنی سیاسی' فقہی' قانونی اور سماجی مسائل' ان سب پر مجتہدانہ رائے دینے' نظر ثانی کرنے اور انہیں اجتہاد کے دائرے میں لانے کی ضرورت ہے۔ چند ایک مسائل درج ذیل ہیں :

- پاکستان اور عالمِ اسلام میں موجود زمینداری اور جاگیرداری کی کیا حیثیت ہے؟
- بے قید نجی ملکیت کو کس قدر تحفظ اور تقدس حاصل ہے؟
- معاشرے میں عورت کے روز افزوں کردار کے پیش نظر شرعی حجاب کی کیا حدود ہیں؟
- عورت کی حکمرانی کے جواز اور عدم جواز پر محققانہ شرعی فیصلہ' مجتہدانہ انداز میں۔
- اسلامی ریاست کا جدید خاکہ' امارت' جمہوریت' خلافت' امامت پر تفصیلی غور و خوض' اسلامی ریاست کے بغیر انفرادی جہاد کا تصور اور بیعتِ جہاد وغیرہ۔
- موجودہ عائلی قوانین کا غیر جانبدارانہ اور مجتہدانہ محاکمہ' اور وقوعِ طلاق کے بارے میں متفقہ نقطۂ نظر۔
- اسلام میں موروثی اور ملوکانہ طرزِ حکومت کا جواز؟
- جنگی قیدیوں کی حیثیت اور ان کا مستقبل؟

(باقی صفحہ ۷۵ پر)

تجھے کیا ملے گا نماز میں؟

تالیف : ابو عبدالرحمٰن شبیر بن نور

(گزشتہ سے پیوستہ)

(۱۳) نیند کے شدید غلبے میں نماز پڑھنا

اگر کسی آدمی پر شدید نیند کا غلبہ ہو' اسے خبر ہی نہ ہو کہ کیا کر رہا ہے یا کیا کہہ رہا ہے' تو ایسی حالت میں اس کو نماز نہیں پڑھنی چاہئے' بلکہ وہ جا کر نیند پوری کر لے یا تھوڑی بہت نیند کر لے تاکہ جاگتے دل و دماغ کے ساتھ نماز ادا کر سکے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

((اِذَا نَعِسَ اَحَدُکُمْ وَھُوَ یُصَلِّیْ فَلْیَرْقُدْ حَتّٰی یَذْھَبَ عَنْهُ النَّوْمُ' فَاِنَّ اَحَدَکُمْ اِذَا صَلّٰی وَھُوَ نَاعِسٌ لَا یَدْرِیْ لَعَلَّهٗ یَسْتَغْفِرُ فَیَسُبُّ نَفْسَهٗ)) (۱۸)

"جب تم میں سے کسی کو دورانِ نماز نیند تنگ کر رہی ہو تو اسے جا کر سو جانا چاہئے اور نیند پوری کرنی چاہئے۔ اگر نماز کے دوران نیند کے دباؤ میں رہے گا تو اسے کیا خبر کہ وہ اپنی طرف سے استغفار کرنا چاہے اور (بے دھیانی میں) اپنے لئے بد دعا کرتا رہے"۔

عام طور پر فرض نمازوں کے اوقات نیند کے اوقات نہیں ہوتے۔ تاہم اگر فرض نماز میں ایسا ہو جائے تو اختصار کے ساتھ کم سے کم فرض نماز پڑھ لینی چاہئے' البتہ نفل نماز چھوڑ کر نیند پوری کرنی چاہئے۔

(۱۴) اطمینان و سکون کے بغیر نماز پڑھنا

ہم اپنے گرد و پیش کو دیکھیں تو جگہ جگہ یہ منظر دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک نمازی مسجد

میں آتا ہے اور جلدی جلدی رکوع کرتا ہے' اسی طرح سجدہ کرتا ہے اور دو چار مرتبہ اٹھک بیٹھک کر کے چلا جاتا ہے اور بزعم خود نماز ادا کر لیتا ہے۔ ایسے جلد بازوں اور ورزش نما نماز پڑھنے والوں کو اللہ کے رسول ﷺ کیا فرماتے ہیں؟ ذرا غور سے پڑھیں اور خود اپنا محاسبہ کر کے دیکھیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ :

اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ الْمَسْجِدَ' فَدَخَلَ رَجُلٌ فَصَلّٰى' ثُمَّ جَاءَ فَسَلَّمَ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ' فَرَدَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ السَّلَامَ' قَالَ ((اِرْجِعْ فَصَلِّ فَاِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ)) فَرَجَعَ الرَّجُلُ فَصَلّٰى كَمَا كَانَ صَلّٰى' ثُمَّ جَاءَ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ' فَسَلَّمَ عَلَيْهِ' فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ((وَعَلَيْكَ السَّلَامُ)) ثُمَّ قَالَ ((اِرْجِعْ فَصَلِّ فَاِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ)) حَتّٰى فَعَلَ ذٰلِكَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ۔ فَقَالَ الرَّجُلُ : وَالَّذِيْ بَعَثَكَ بِالْحَقِّ! مَا اَحْسِنُ غَيْرَ هٰذَا' عَلِّمْنِيْ۔ قَالَ : ((اِذَا قُمْتَ اِلَى الصَّلَاةِ فَكَبِّرْ' ثُمَّ اقْرَءْ مَا تَيَسَّرَ مَعَكَ مِنَ الْقُرْآنِ' ثُمَّ ارْكَعْ حَتّٰى تَطْمَئِنَّ رَاكِعًا' ثُمَّ ارْفَعْ حَتّٰى تَعْتَدِلَ قَائِمًا' ثُمَّ اسْجُدْ حَتّٰى تَطْمَئِنَّ سَاجِدًا' ثُمَّ ارْفَعْ حَتّٰى تَطْمَئِنَّ جَالِسًا' ثُمَّ افْعَلْ ذٰلِكَ فِيْ صَلَاتِكَ كُلِّهَا)) (۱۹)

"رسول اللہ ﷺ مسجد میں تشریف لائے' (اس دوران) ایک آدمی آیا' اس نے نماز ادا کی' اس کے بعد آ کر رسول اللہ ﷺ کو سلام کیا۔ آپ نے سلام کا جواب دے کر فرمایا: "واپس جا کر نماز پڑھو' کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی"۔ آدمی واپس گیا اور اسی طرح نماز پڑھی جس طرح پہلی مرتبہ نماز پڑھی تھی' پھر آ کر رسول اللہ ﷺ کو سلام پیش کیا۔ آپ نے وعلیکم السلام کہہ کر سلام کا جواب دیا اور فرمایا: "واپس جا کر نماز پڑھو' کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی"۔ آپ نے اس کے ساتھ یہ معاملہ تین دفعہ کیا' آخر آدمی کہہ اٹھا: اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے' میں اس سے اچھی نماز نہیں پڑھ سکتا' آپ مجھے سکھا دیں۔ آپ نے فرمایا: "جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو تو اللہ اکبر کہو' پھر قرآن کا جو حصہ تم بآسانی پڑھ سکتے ہو اسے

پڑھ لو' پھر اطمینان کے ساتھ رکوع کرو' پھر رکوع سے کھڑے ہو جاؤ اور بالکل سیدھے کھڑے ہو جاؤ' پھر پورے اطمینان سے سجدہ کرو' حتیٰ کہ پورے اطمینان سے سجدہ کرو' پھر سجدہ سے سر اٹھاؤ اور اطمینان سے بیٹھ جاؤ' اور اسی طرح ساری نماز ادا کرو"۔

واضح رہے کہ یہ آدمی سلیقے سے نماز پڑھنا جانتا ہی نہ تھا' اس کے باوجود اس کی نماز کو رسول اکرم ﷺ نے قابل قبول قرار نہیں دیا۔ اس کے مقابلے میں جو لوگ جاننے کے باوجود ایسی نمازیں ادا کرتے ہیں وہ قیامت کے دن اپنا حساب سوچ لیں۔ شرط یہ ہے کہ انہیں قیامت کے دن پر ایمان ہو' ورنہ تو معاملہ ہی صاف ہے۔

⑮ تا ⑰ تین بدقسمت

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا :

((ثَلاَثَةٌ لاَ تَجَاوَزُ صَلاَتُهُمْ اٰذَانَهُمْ : اَلْعَبْدُ الْآبِقُ حَتّٰى يَرْجِعَ ' وَامْرَاَةٌ بَاتَتْ وَزَوْجُهَا عَلَيْهَا سَاخِطٌ ' وَاِمَامُ قَوْمٍ وَهُمْ لَهُ كَارِهُوْنَ)) (٢٠)

"تین قسم کے آدمی ایسے ہیں جن کی نمازیں ان کے کانوں سے اوپر نہیں جاتیں (قبول نہیں ہوتیں) : (١) مالک سے بھاگا ہوا غلام' جب تک واپس نہ آ جائے' (٢) عورت رات گزارے اور اس کا خاوند اس پر ناراض ہو' (٣) ایسا امام جس کی قوم (نمازی) اسے ناپسند کرتے ہوں"۔

علماء نے اس حدیث کی شرح میں مندرجہ ذیل باتیں بیان کی ہیں :

(١) جس طرح بھاگے ہوئے غلام کی نماز قبول نہیں ہوتی اسی طرح کام سے بھاگنے والے ملازم کی نماز بھی خطرے میں ہے۔ نیز کام چور ملازم جو اپنے حقوق تو پورے وصول کر رہا ہے البتہ مالک کا حق پورا نہیں دے رہا اس حکم میں ہے۔

(٢) اگر عورت اپنے خاوند کی نافرمان ہو' یا بلانے پر چارپائی پر نہ آئے یا کوئی غلط حرکت کرے جس سے خاوند کو واضح اختلاف ہو تو اس کی نماز کی خیر نہیں' البتہ اگر خاوند کا مطالبہ ہی شرعاً غلط ہو تو عورت پر کوئی گناہ نہیں۔

(٣) اگر امام کی دین داری یا بداخلاقی کی وجہ سے لوگ اسے ناپسند کریں تو اس کی اپنی نماز

خطرے میں ہے اور اگر سنّت کے مطابق عمل کرنے یا حق بیان کرنے سے لوگ ناراض ہوتے ہوں تو یہ لوگوں کا قصور ہے' امام کا نہیں۔

⑱ تیز خوشبو لگانے والی عورت کی نماز

شریعت کا اصول یہ ہے کہ مَرد ایسی خوشبو استعمال کرے جس میں رنگ نہ ہو اور اس کی مہک دوسروں تک جائے' البتہ عورت اس قسم کی خوشبو لگائے جس میں چاہے رنگ ہو البتہ اس کی مہک دوسروں تک نہ جائے' تاکہ خوشبو کی وجہ سے کوئی غیر محرم مرد اس کی طرف متوجہ نہ ہو[۲۱] حتیٰ کہ پھیلنے والی خوشبو لگانے والی عورت کو رسول اللہ ﷺ نے زنا کار یا زنا کی دعوت دینے والی عورت قرار دیا ہے[۲۲] اور تیز خوشبو لگا کر مسجد آنے والی عورت کی نماز اللہ کے ہاں قبول نہیں۔ ایک مرتبہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ ایک عورت مسجد سے نکل رہی ہے اور اس سے تیز خوشبو اٹھ رہی ہے۔ آپؓ نے اسے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے :

((لَا تُقْبَلُ صَلَاةُ لِامْرَءَةٍ تَطَيَّبَتْ لِهٰذَا الْمَسْجِدِ حَتّٰى تَرْجِعَ فَتَغْتَسِلَ غُسْلَهَا مِنَ الْجَنَابَةِ)) [۲۳]

"اُس عورت کی نماز قبول نہیں ہوتی ہے جو اس مسجد میں خوشبو لگا کر آئے' یہاں تک کہ وہ واپس جا کر نہایت اچھی طرح غسل کرے جس طرح جنابت کا غسل کرتی ہے"۔

البتہ گھر میں محرم رشتہ داروں اور بالخصوص خاوند کے پاس ہر قسم کی خوشبو لگانے کی اجازت ہے اور نماز بھی پڑھی جا سکتی ہے' کیونکہ فتنے کا خطرہ نہیں ہوتا۔

⑲ باریک دوپٹے میں نماز پڑھنا

مسلمانوں کی سلطنت و شوکت پر جب سے زوال آیا ہے وہ ہر طرف سے محرومیوں کی طرف جا رہے ہیں' حتیٰ کہ اب تو غیرت و حمیت کا بھی جنازہ نکل رہا ہے۔ عورت پہلے گھر سے باپردہ نکلی' پھر چادر لے کر نکلی' پھر باریک دوپٹے میں آگئی' پھر دوپٹہ گلے میں رسّی کی شکل بن گیا اور اب وہ رسّی بھی نہیں رہی۔ فَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ

حتیٰ کہ جو عورتیں نماز پڑھنے والی ہیں انہیں بھی اکثر خبر نہیں ہوتی کہ اتنے باریک دوپٹے میں نماز قابل قبول نہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

((لاَ تُقْبَلُ صَلاَةُ الْحَائِضِ اِلاَّ بِخِمَارٍ)) (۲۴)

"بالغ عورت کی نماز اوڑھنی کے بغیر قبول نہیں ہوتی"۔

امام ترمذی رحمہ اللہ اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں: "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا والی حدیث بہت خوب حدیث ہے' تمام اہل علم کے نزدیک اس پر عمل کیا جاتا ہے۔ متفقہ فتویٰ یہ ہے کہ بالغ عورت جب نماز پڑھے اور اس کے چند بال کھلے رہ جائیں تو اس کی نماز قبول نہیں ہوتی"۔

ہمارے ہاں عالم یہ ہے کہ شفون' کریپ' جارجٹ اور اس قسم کے جتنے باریک سے باریک کپڑے دوپٹے کے نام سے بکتے ہیں ان میں سارے ہی بال مکمل صفات و تفصیلات کے ساتھ نظر آ رہے ہوتے ہیں۔ ایسی عورتوں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے : ((كَاسِيَاتٌ عَارِيَاتٌ)) "کپڑے پہننے کے باوجود ننگی ہیں" اور انجام بھی بتا دیا ((لاَ يَدْخُلْنَ الْجَنَّةَ وَلاَ يَجِدْنَ رِيْحَهَا)) (۲۵) "نہ جنت میں داخل ہو سکیں گی نہ انہیں اس کی خوشبو نصیب ہو گی"۔

دوسری طرف اُم المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنی بھتیجی حفصہ بنت عبدالرحمٰن کے سر پر باریک دوپٹہ دیکھا تو اسے لے کر پھاڑ دیا اور اس کے بدلے اسے موٹا دوپٹہ پہنایا۔ (۲۶)

آج کہاں ہیں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو ماں کا درجہ دینے والیاں اور ان سے محبّت و عقیدت کے گن گانے والیاں؟

⑳ ٹخنوں سے نیچے کپڑا لٹکا کر نماز ادا کرنا

نماز کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کر کے جہنم سے نجات اور جنت تک پہنچنے کی کوشش کرنا ہے' لہٰذا ضروری ہے کہ نماز ان احکام و آداب کے ساتھ پڑھی جائے جو اللہ

تعالیٰ کی رضا جوئی کا سبب بنیں' نہ کہ اس کیفیت و انداز میں پڑھی جائے جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب ہوتے ہیں۔ درج ذیل احادیث پر غور کریں' اس کے بعد خود ہی سوچیں کہ جو آدمی ٹخنوں سے نیچے کپڑا لٹکائے رکھے اس کا آخرت میں کیا انجام ہو گا؟ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

((ثَلاَثَةٌ لاَ يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلاَ يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ وَلاَ يُزَكِّيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ)) قَالَ فَقَرَاَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلاَثَ مِرَارٍ' قَالَ اَبُوْذَرٍ : خَابُوْا وَخَسِرُوْا' مَنْ هُمْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ : ((اَلْمُسْبِلُ وَالْمَنَّانُ وَالْمُنْفِقُ سِلْعَتَهُ بِالْحَلْفِ الْكَاذِبِ)) (۲۷)

"قیامت کے روز اللہ تعالیٰ تین قسم کے آدمیوں سے بات نہیں کرے گا' نہ ہی ان کی طرف (نظر رحمت سے) دیکھے گا' نہ انہیں گناہوں سے پاک کرے گا اور ان کے لئے تکلیف دہ عذاب ہو گا"۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جملے تین دفعہ دہرائے۔ ابوذرؓ نے کہا: ایسے لوگ تو خسارے میں رہے اور شدید ناکام رہے' یہ کون لوگ ہیں اے اللہ کے رسول؟ آپؐ نے فرمایا: (۱) کپڑے کو ٹخنوں سے نیچے لٹکانے والا۔ (۲) احسان کر کے جتانے والا۔ (۳) جھوٹی قسم کے ذریعے مال تجارت بیچنے والا"۔

عام حالات میں کپڑے کو ٹخنوں سے نیچے رکھنا اللہ تعالیٰ کو اس قدر ناپسند ہے تو نماز میں ایسی حرکت کیونکر برداشت ہو سکتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

((مَنْ اَسْبَلَ اِزَارَهُ فِيْ صَلاَتِهِ خُيَلاَءَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ حِلٍّ وَّلاَ حَرَامٍ)) (۲۸)

"جس نے نماز میں اپنے کپڑے کو ازراہ تکبر ٹخنے سے نیچے رکھا تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ حلال و حرام کی حدود سے نکل گیا"۔

امام مناوی رحمہ اللہ نے حدیث بالا کی شرح میں لکھا ہے :

قِيْلَ لاَ يُؤْمِنُ بِحَلاَلِ اللّٰهِ وَحَرَامِهِ

"ایک قول یہ ہے کہ اس کا معنی ہے کہ : وہ اللہ کے حلال و حرام پر ایمان ہی نہیں لایا"۔

امام نووی رحمہ اللہ نے اس کی شرح کرتے ہوئے فرمایا :

معناه بَرِی مِنَ اللّٰهِ وَفَارَقَ دِينَه (۲۹)

"اس کا معنی ہے کہ وہ اللہ سے بری ہو گیا اور اپنے دین کو چھوڑ بیٹھا"۔

ان واضح نصوص اور قابل اطمینان علماء کی تفسیرات کے بعد بھی کسی کو اس شخص کی نماز کے بارے میں خوش فہمی ہو سکتی ہے؟

(۲۱) قبر کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنا

حدودِ قبرستان میں نماز پڑھنا یقیناً منع ہے' اور پھر بالکل قبر کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا تو اور بھی شدت کے ساتھ منع ہے' بلکہ اگر معاملہ شرک یا (۳۰) مشابہ شرک کا ہو تو بات نماز کی عدم قبولیت یا گناہ سے آگے بڑھ کر کفر و شرک میں داخل ہو جاتی ہے۔ اس راستے کو سرے سے بند کرنے کے لئے نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا :

((لَا تُصَلُّوْا اِلَى الْقُبُوْرِ وَلَا تَجْلِسُوْا عَلَيْهَا)) (۳۱)

"قبروں کی طرف منہ کر کے نماز مت پڑھو اور نہ ہی ان پر بیٹھو"۔

واضح رہے کہ تاریخ انسانیت گواہ ہے کہ شرک کی ابتداء ہمیشہ غیر ضروری تعظیم سے شروع ہوتی ہے۔ اور کسی قبر کی طرف رُخ کر کے نماز ادا کرنا اس کی شدید تعظیم ہے۔ اسی لئے نبی ﷺ نے اس راستے ہی کو بند کر دیا ہے۔

(۲۲) رزق حرام کھانے والے کی نماز

جس طرح غذا سارے جسم کے نظام کو صحیح رکھتی ہے' اسے تکلیفوں سے بچاتی ہے' جسم کی نشوونما میں اپنا کردار ادا کرتی ہے' اسی طرح رزقِ حلال نیکیوں کے نظام کو صحیح رکھتا ہے' ان کو ضائع ہونے سے بچاتا ہے اور قیامت کے دن تک ان کی حفاظت کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

((اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ اللّٰهَ طَيِّبٌ لَا يَقْبَلُ اِلَّا طَيِّبًا' وَاِنَّ اللّٰهَ اَمَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ بِمَا اَمَرَ بِهِ الْمُرْسَلِيْنَ' فَقَالَ : ﴿ يٰاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴾ (المومنون : ۵۱) وقال :

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ﴾ (البقرہ : ۱۷۲) ثُمَّ ذَكَرَ الرَّجُلَ يُطِيْلُ السَّفَرَ اَشْعَثَ اَغْبَرَ يَمُدُّ يَدَيْهِ اِلَى السَّمَاءِ : يَارَبِّ! يَارَبِّ! وَمَطْعَمُهٗ حَرَامٌ ، وَمَشْرَبُهٗ حَرَامٌ ، وَمَلْبَسُهٗ حَرَامٌ وَغُذِيَ بِالْحَرَامِ، فَاَنّٰى يُسْتَجَابُ لِذٰلِكَ؟)) (۳۲)

"اے لوگو! اللہ کی ذات طیب ہے اور صرف پاکیزہ چیز قبول کرتی ہے۔ اور اللہ نے جس چیز کا حکم رسولوں کو دیا اسی چیز کا حکم اہلِ ایمان کو دیا۔ چنانچہ فرمایا: "پاکیزہ رزق کھاؤ اور نیک عمل کرو اور جو کچھ تم کر رہے ہو میں اس سے خوب واقف ہوں"۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اے ایمان والو! جو کچھ ہم نے تم کو عطا کیا ہے اس میں سے پاکیزہ کھاؤ"۔ ان دو آیتوں کے بعد آپؐ نے اس آدمی کا ذکر فرمایا جو لمبا سفر کر کے آتا ہے' (سفر کی وجہ سے) اس کے بال پراگندہ ہو جاتے ہیں' جسم غبار آلود ہو جاتا ہے وہ آسمان کی طرف اپنے ہاتھ اٹھا کر یارب یارب کرتا ہے اور حال یہ ہے کہ اس کا کھانا حرام کا' پینا حرام کا' لباس حرام کا اور ساری غذا حرام کی۔ ایسے شخص کی دعا کیونکر قبول ہو؟"

ایک دوسری حدیث میں آپ ﷺ نے اس حقیقت کو مزید واضح انداز میں بیان فرمایا :

((يَا كَعْبُ بْنُ عُجْرَةَ : اِنَّهٗ لَا يَرْبُوْ لَحْمٌ نَبَتَ مِنْ سُحْتٍ اِلَّا كَانَتِ النَّارُ اَوْلٰى بِهٖ)) (۳۳)

"اے کعب بن عجرہ! جو گوشت حرام پر پلا ہو اس کا سب سے مناسب ٹھکانا جہنم ہے"۔

کسی امام کا قول ڈھونڈنے یا کسی مفتی سے فتویٰ حاصل کرنے سے پہلے دل پر ہاتھ رکھ کر غور کر لیں کہ جس انسان کی رگوں میں حرام کا خون دوڑ رہا ہو' اس کی پوشاک حرام کی ہو اور ساری غذا ہی حرام کی ہو' اس کی دعا تک قبول نہ ہوتی ہو' اس کی نماز کیسے قبول ہو جائے گی۔ نتیجتاً لازمی ٹھکانا جہنم میں ہو گا۔ (اَعاذنا اللہ منہ)

(۲۳) نماز کے ساتھ ساتھ فحشاء و منکرات کو اپنانا

نماز اللہ تعالیٰ کے ساتھ گہرے رابطے اور تعلق کا ذریعہ ہے۔ اور جس آدمی کا

فی الواقع اللہ تعالیٰ سے گہرا رابطہ و تعلق ہو اس کے لئے فحشاء و منکرات پر عمل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ لہٰذا جو آدمی ایسی روحانی بیماریوں میں ملوث ہو اس کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ نماز اس کی سیرت و کردار پر کوئی اثر نہیں رکھتی۔ اللہ تعالیٰ نے نماز کا وصف لازم اور وصف مطلوب بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا :

﴿ اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ ﴾ (العنکبوت : ۴۵)

"(اے نبی!) تلاوت کرو اس کتاب کی جو تمہاری طرف وحی کے ذریعے سے بھیجی گئی ہے' اور نماز قائم کرو' یقیناً نماز فحش اور برے کاموں سے روکتی ہے"۔

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ اس آیت میں مذکور نماز کے اوصاف کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں :

"اب رہا یہ سوال کہ آدمی نماز کی پابندی اختیار کرنے کے بعد عملاً بھی برائیوں سے رکتا ہے یا نہیں' تو اس کا انحصار خود اس آدمی پر ہے جو اصلاحِ نفس کی یہ تربیت لے رہا ہو۔ وہ اس سے فائدہ اٹھانے کی نیت رکھتا ہو اور اس کی کوشش کرے تو نماز کے اصلاحی اثرات اس پر مترتب ہوں گے' ورنہ ظاہر ہے کہ دنیا کی کوئی تدبیر اصلاح بھی اس شخص پر کارگر نہیں ہو سکتی جو اس کا اثر قبول کرنے کے لئے تیار ہی نہ ہو' یا جان بوجھ کر اس کی تاثیر کو دفع کرتا رہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے غذا کی لازمی خاصیت بدن کا تغذیہ اور نشوونما ہے' لیکن یہ فائدہ اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جبکہ آدمی اسے جزوِ بدن بننے دے۔ اگر کوئی شخص ہر کھانے کے بعد فوراً ہی قے کر کے ساری غذا باہر نکالتا چلا جائے تو اس طرح کا کھانا اس کے لئے کچھ بھی نافع نہیں ہو سکتا۔ جس طرح ایسے شخص کی نظیر سامنے لا کر آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ غذا موجب تغذیۂ بدن نہیں ہے کیونکہ فلاں شخص کھانا کھانے کے باوجود سوکھتا چلا جا رہا ہے' اسی طرح بدعمل نمازی کی مثال پیش کر کے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ نماز برائیوں سے روکنے والی نہیں ہے کیونکہ فلاں شخص نماز پڑھنے کے باوجود بدعمل ہے۔ ایسے نمازی کے متعلق تو یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ وہ درحقیقت نماز نہیں پڑھتا' جیسے کھانا کھا کر قے کر دینے والے کے متعلق یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ وہ درحقیقت

کھانا نہیں کھاتا"۔ (تفہیم القرآن ۳/۷۰۷، سورۃ العنکبوت، آیت ۴۵)

یہی بات متعدد احادیث، آثارِ صحابہ و اقوالِ تابعین میں مروی ہے۔ آیت مذکورہ کے ضمن میں امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے احادیث اور متعدد اقوال ذکر کئے ہیں، جن کی صحت کا دعویٰ کرنا تو ہمارے لئے ممکن نہیں، البتہ آیت کریمہ کی روشنی میں یہ بات اطمینان سے کہی جاسکتی ہے کہ احادیث، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین کے اقوال روحِ قرآنی کے عین مطابق ہیں۔ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"جس شخص کو اس کی نماز فحش اور بُرے کاموں سے نہ روکے اس کی نماز ہی نہیں۔"

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"جس کو نماز فحش اور بُرے کاموں سے نہ روکے تو اس کو یہ نماز اللہ تعالیٰ سے اور دُور کردے گی"۔

یہی بات موقوفاً بھی بیان ہوئی ہے (حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا اپنا ذاتی قول)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے بیان کرتے ہیں :

"جو شخص نماز کی اطاعت نہ کرے اس کی کوئی نماز نہیں، اور نماز کی اطاعت یہ ہے کہ اسے فحش اور برے کاموں سے روک دے"۔

ان احادیث کے معنی میں متعدد صحابہ و تابعین کے اقوال بھی موجود ہیں۔

غیر عرب معاشروں میں نماز کے اثر پذیر نہ ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ نمازی کو پتہ ہی نہیں ہوتا کہ وہ اپنے رب سے کیا کہہ رہا ہے۔ گویا کہ طوطے کی زبان بول رہا ہے یا ٹیپ ریکارڈر چل رہا ہے۔ لہٰذا اگر نماز کے الفاظ کے ساتھ ساتھ ترجمہ و معانی بھی یاد کرلئے جائیں تو فائدے اور اثر پذیری کے امکانات بڑھ سکتے ہیں۔ "پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری دعائیں" مؤلفہ مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی اس ضمن میں بہترین کتاب ہے۔

(۴۴) نماز میں بدعت ایجاد کرنا

قبولیت عبادت کی دو بنیادی شرطیں ہیں :

۱۔ اللہ کے لئے اخلاص، یعنی صرف اللہ کی رضاجوئی مقصود ہو۔

۲۔ رسول اکرم ﷺ کی اطاعت کیونکہ جو عبادت اطاعت رسول کی حدود میں کی جائے وہ مقبول عبادت ہے اور اگر اس میں اپنی طرف سے کسی قسم کی کمی بیشی کی جائے تو وہ بدعت کہلاتی ہے اور ایسی عبادت اللہ تعالیٰ کے ہاں قطعاً قبول نہیں ہوتی۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے۔

((مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَیْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ)) (۳۴)

"جس نے ہمارے دین میں کوئی ایسی چیز ایجاد کی جو اس کا حصہ نہیں ہے تو وہ ناقابل قبول ہے۔"

نہ صرف ایسا کام کرنے والے کا عمل قابل قبول نہیں بلکہ اس کی اتباع کرنے والے کا عمل بھی قابل قبول نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :

((مَنْ عَمِلَ عَمَلاً لَیْسَ عَلَیْهِ اَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ)) (۳۵)

"جس شخص نے کوئی ایسا کام کیا جس پر ہمارا حکم نہیں ہے تو وہ مردود ہے' یعنی ناقابل قبول ہے۔"

دین میں بدعت ایجاد کرنا تو ایسی خطرناک بیماری ہے کہ اُس آدمی کی توبہ بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں اُس وقت تک قبول نہیں ہوتی جب تک کہ وہ بدعت کو نہ چھوڑ دے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا :

((اِنَّ اللّٰهَ حَجَبَ التَّوْبَةَ عَنْ صَاحِبِ كُلِّ بِدْعَةٍ)) (۳۶)

"اللہ تعالیٰ نے ہر صاحب بدعت کی توبہ قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔"

یعنی جب تک وہ اپنی بدعت پر رہے گا توبہ کا دروازہ اس پر بند رہے گا۔ البتہ بدعت چھوڑ دینے کے بعد اس کی توبہ قبول ہو گی۔

حواشی

۱۸) صحیح البخاری' کتاب الوضوء' باب ۵۲' ح : ۲۰۹' وصحیح مسلم' کتاب صلاۃ المسافرین' باب امر من نعس فی صلاتہ' ح : ۷۸۶

۱۹) صحیح البخاری ' کتاب صفة الصلاة' باب حد الرکوع والاعتدال فیه . .الخ

ح : ۷۶۰' صحیح مسلم' کتاب الصلاۃ' باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ. ..الخ ح : ۳۹۷

۲۰) سنن الترمذی' کتاب الصلاۃ' ح : ۳۶۰' باب فیمن ام قومًا وھم لہ کارھون۔ علامہ احمد شاکر نے حدیث کو صحیح کہا ہے (۱۹۳/۱) جبکہ علامہ الالبانیؒ نے حسن قرار دیا ہے۔ صحیح الجامع ح : ۳۰۵۷

۲۱) اس مضمون کو سنن الترمذی ح : ۲۲۳۸ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

۲۲) سنن الترمذی' کتاب الاستئذان' باب ۶۸۔ و سنن ابی داؤد' ح : ۵۱۶۳

۲۳) سنن ابی داؤد' کتاب الترجل' باب فی المرءۃ' تتطیب للخروج' ح : ۴۱۷۴۔ سنن ابن ماجہ' کتاب الفتن' باب فتنۃ النساء' ح : ۴۰۰۲

۲۴) سنن الترمذی' کتاب الصلاۃ' باب ۲۷۳ ح : ۳۷۸ و سنن ابن ماجہ' کتاب الطھارۃ' باب ۱۳۲ ح : ۶۵۵ علامہ البانی نے حدیث کو صحیح کہا ہے۔

۲۵) صحیح مسلم' کتاب اللباس' باب ۳۴' ح : ۲۱۲۸

۲۶) موطا امام مالک' کتاب اللباس' باب ۴ ح : ۶۔۲/۹۱۳

۲۷) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان غلظ تحریم اسبال الازار ..الخ ح : ۱۰۶ نیز سنن اربعہ میں بھی یہ حدیث موجود ہے۔

۲۸) سنن ابی داؤد' کتاب الصلاۃ' باب الاسبال فی الصلاۃ ح : ۶۳۷ علامہ الالبانیؒ نے سنن ابی داؤد کی تحقیق میں حدیث کو صحیح کہا ہے۔ ملاحظہ ہو صحیح سنن ابی داؤد' ح : ۵۹۵

۲۹) فیض القدیر ۶ / ۶۸ ح : ۸۳۹۹

۳۰) قبر کی عبادت کی نیت سے نماز پڑھنا یقینی طور پر شرک ہے۔ اور صاحب قبر کی قربت یا امید شفاعت کے ساتھ اُس کی قبر کے پاس نماز پڑھنا خطرۂ شرک سے خالی نہیں۔

۳۱) صحیح مسلم' کتاب الجنائز' باب النھی عن الجلوس علی القبر والصلاۃ علیہ۔ ح : ۹۷۲ یہی حدیث دیگر کتب حدیث میں بھی بیان ہوئی ہے۔

۳۲) صحیح مسلم' کتاب الزکاۃ' باب قبول الصدقۃ من الکسب الطیب وتربیتھا ح : ۱۰۱۵ و دیگر کتب حدیث

۳۳) سنن الترمذی' ابواب السفر' باب فضل الصلاۃ ح : ۶۱۷ علامہ البانی نے حدیث کو صحیح کہا ہے۔ مسند احمد ۳۲۱/۳ و صحیح ابن حبان (الاحسان) ۹/۵' ح : ۱۷۲۳ و المستدرک للحاکم ۴۲۲/۴ و سنن الدارمی ۴۰۹/۲' باب فی اکل السحت'

ح : ۲۷۷۶

۳۴) صحیح البخاری' کتاب الصلح' ' باب ۵' ح : ۲۶۹۷ (الفتح ۳۵۵/۵)۔ صحیح مسلم' کتاب الاقضیۃ' ح ۱۷۱۸' باب ۸

۳۵) صحیح مسلم' حوالہ سابقہ

۳۶) المعجم الاوسط للطبرانی ۱۱۳/۵' ح : ۴۲۱۴۔ امام الہیثمی نے حدیث کو صحیح کہا ہے۔ ملاحظہ ہو مجمع الزوائد' ۳۰۷/۱۰ ح : ۱۷۴۵۷۔ کتاب التوبہ' باب ۱۔ نیز علامہ الالبانی نے بھی حدیث کو صحیح کہا ہے۔ السلسلۃ الصحیحۃ' ح : ۱۹۲۰' اور متعدد حوالوں کا تذکرہ کیا ہے۔

بقیہ : اجتہاد ۔ ایک ضرورت' ایک نعمت

- پوسٹ مارٹم اور اعضاء کی پیوند کاری' نیز انتقالِ خون کا جواز؟
- عورت کی نصف گواہی اور نصف دیت جدید حالات اور مسائل و وسائل کے تناظر میں؟
- ایک امیر المؤمنین کا تصور؟ یا مختلف علاقوں میں الگ الگ نظامِ خلافت؟
- اسلامی ریاست کے سربراہ کے علاوہ کسی اور کی بیعت کا تصور اور جواز؟
- چاروں شرعی حدود کے بارے میں شیعہ سُنّی اختلاف کے درمیان توافق کی صورت؟
- اسلام میں پبلک لاء اور پرسنل لاء کے تصورات اور حدودِ کار؟
- انتخاب امیر (حکمران) کی شرائط' امیر کی اہلیت اور طریق کار؟
- سود کے بغیر عالمی بینکنگ کے سسٹم کا قابل عمل خاکہ اور سود کی تعریف کے بارے میں جامع تصور۔

قرآن اکیڈمی کراچی کا نیا ای میل ایڈریس

رفقاء و احباب نوٹ فرمالیں کہ قرآن اکیڈمی کراچی کا نیا ای میل ایڈریس درج ذیل ہے :

quran@khi.fascom.com

شرعی پردہ اور ہماری خواتین

تحریر : مسز عاتکہ خان

﴿ یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤی اَنْ یُّعْرَفْنَ فَلَا یُؤْذَیْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا۝ ﴾ (الاحزاب : ۵۹)

"اے نبیؐ ! اپنی بیویوں' اپنی بیٹیوں اور اہل ایمان کی عورتوں سے فرمادیں کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلو لٹکالیا کریں (گھونگھٹ نکال لیا کریں) یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور نہ ستائی جائیں۔ اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔"

پردہ اپنی مقررہ حدود کے ساتھ ایک شرعی حکم اور دینی ہدایت ہے۔ عورت کا پردہ بلاشبہ ایک شرعی اور دینی امر ہے۔ لیکن وہ بذاتہٖ مقصود نہیں' بلکہ ایک ایسی مہلک اور خطرناک علت سے بچانے کی تدبیر کے طور پر رکھا گیا ہے جو انسانیت' انسانی فرد اور انسانی معاشرے سب کیلئے مہلک ہے۔ اس کے متعدی اثرات سے معاشرہ بالآخر تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ اور کیا شان ہے اس پاک ذات اور رحیم و کریم ہستی کی کہ اس نے انسانیت کو تباہی و بربادی سے بچانے کیلئے اور بالخصوص اُمت مسلمہ کی بھلائی کیلئے معاشرے کی پاکیزگی کے لوازمات فراہم کئے ہیں۔ لیکن اب یہ ہماری قوم کا المیہ ہے کہ وہ پردہ کو دقیانوسی چیز سمجھتی ہے۔ جو جتنا "بے پردہ" ہے وہ اتنا ہی "مہذب" ہے' اور جو جتنا "باپردہ" ہے وہ اتنا ہی' بلکہ بہت زیادہ "جاہل" سمجھا جاتا ہے۔ یہ صورتِ حال ہماری مسلم اُمت کا المیہ ہے۔ بُرائی کو شروع میں بُرائی ہی سمجھ کر کیا جاتا ہے' لیکن جب وہ عام ہو جائے تو اس کے حق میں دلائل پیش کئے جاتے ہیں اور اس کا حق ہونا ثابت کیا جاتا ہے۔

آج کل اگر کسی کو پردے کی ترغیب دلائی جائے تو جواب ملتا ہے کہ اصل پردہ تو دل کا ہوتا ہے۔ "دل کا پردہ" (قلب و نظر کا پردہ) کی اصطلاح بظاہر عین اسلامی معلوم ہوتی ہے اور ایک انسان اس اصطلاح کے پُرکشش اور خوش نما الفاظ سے دھوکہ کھا سکتا ہے۔ لہٰذا جو لوگ

یہ بات اسلام کے حوالے سے کرتے ہیں تو انہیں اس کا جواب بھی اسلام ہی کی روشنی میں دیا جانا چاہئے۔ "دل کا پردہ" کس قدر احمقانہ دلیل ہے ـــــ چلو مان لیا کہ آپ کو اپنی نیت پر بڑا مان ہے اور بہت اعتماد و بھروسہ ہے اور اسی اعتماد و بھروسے کی بدولت آپ بھرے بازار میں میک اپ سے مزین چہرے اور خوبصورت فٹنگ والے لباس میں گھوم سکتی ہیں' لیکن کیا آپ کسی غیر مرد کی نیت کے بارے میں گارنٹی دے سکتی ہیں؟ ہرگز نہیں ـــــ اس کی مثال بالکل ایسے ہی ہے جس طرح آپ اپنی سیف میں اپنے قیمتی زیورات اور مال و دولت رکھ دیں اور تالا لگا کر اس کی چابی سیف کے اوپر ہی رکھ دیں اور پھر یہ توقع کریں کہ اگر چور آئے گا تو تالا دیکھ کر واپس مڑ جائے گا' چابی کو ہاتھ لگانے کی زحمت تک نہیں کرے گا۔

اگر ہم "دل کے پردے" کو ہی اصل "اسلامی پردہ" تصور کر لیں تو قرآن پاک کی وہ آیات کہ جن میں رسول اللہ ﷺ کی پاک ازواج' بیٹیوں اور عام مسلمان عورتوں کو بڑی چادر سے اپنے جسم کو ڈھانپنے کا حکم دیا گیا ہے' بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ کیا ازواجِ مطہرات نعوذ باللہ' ثم نعوذ باللہ نیک دل نہ تھی یا ان کی آنکھوں میں حیا نہ تھی جو پردہ کے احکامات کی ضرورت پیش آئی۔ اور قرآن پاک کب یہ کہتا ہے کہ "قلب و نظر" کے پردے والیاں چادریں اور برقعے اتار کر پھینک دیں اور بے پردہ حالت میں گھروں سے باہر نکلیں۔ جبکہ ایک مسلمان عورت کی ستر پوشی تو اس کی پیدائش سے لے کر کفن دفن تک باقی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر ہم "دل کے پردے" کو ہی کافی سمجھیں تو پھر قرآن پاک کی وہ فہرست جو محرم و نامحرم کے سلسلہ میں نازل ہوئی' وہ کہاں جائے گی؟ جو عورتیں "اپنے اوپر اپنی چادروں کے گھونگھٹ" اور "اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے بکل مارنے" کے واضح قرآنی احکامات پر ہی عمل نہ کریں' تو وہ قرآن کے دیگر احکامات پر کس طرح عمل کر سکتی ہیں۔

بے شک پردے کی اصل روح "شرم و حیا" ہے۔ لیکن یوں تو نماز کی اصل روح عاجزی اور انکساری ہے' روزہ کی روح تقویٰ ہے' قربانی کی روح خود سپردگی ہے۔ لہٰذا اگر ہر عبادت کی ظاہری شکل کو ختم کر کے دل کی نماز' دل کا روزہ' دل کی زکوٰۃ اور دل کا حج ہی سمجھ لیا جائے تو پھر نماز کے لئے وضو کرنے اور مسجد میں جانے کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ زکوٰۃ کے لئے پیسہ نکالنے اور حج کے لئے مکّۃ المکرمہ جانے کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ حقیقتاً اسلام کی تمام عبادات بشمول پردہ اپنی اصل رُوح کے ساتھ ساتھ ایک اصل قالب بھی رکھتی ہیں۔ ہر عبادت کی ادائیگی کے مخصوص آداب ہوتے ہیں جن کے بجالانے سے اس عبادت کی ادائیگی کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی طرح پردے کی ادائیگی کے بھی کچھ آداب و طریقے ہیں جن

کا اظہار ستر پوشی' حجاب و برقعہ کی صورت میں ہوتا ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ "دل کے پردے" کی آڑ میں "باپردہ" ہونے کا دعویٰ سراسر منافقت ہے۔ یہ کیسی "نیک نیت" ہے کہ اس سے ظہور میں آنے والے اعمال بدنیتی کا پتہ دیں' دل میں تو پردہ ہے مگر سر سے پاؤں تک بے پردہ ہے۔

کچھ لوگ یہ گلہ بھی کرتے ہیں کہ جدید دور کے جدید تقاضے ہیں اور یہ وہ دور نہیں کہ گھر میں رہ کر جدید تعلیم حاصل کی جا سکے۔ اس طرح پردہ کی وجہ سے عورتیں اعلیٰ اور جدید تعلیم سے محروم رہ جائیں گی۔ عورت کا پردہ بلوغت سے شروع ہوتا ہے اور اس سے پہلے پہلے ضروری تعلیم حاصل کی جا سکتی ہے۔ پھر دوسری بات یہ ہے کہ اسلام وہ تعلیم چاہتا ہی کب ہے جو پردہ ہی قطع کروا دے۔ اگر ہماری خواتین اسلام پر چلنا چاہیں اور اس کے مطابق زندگی گزارنا چاہیں تو پتہ چلتا ہے کہ عورت کی اصل تعلیم' اس کا اصل حسن گھر میں ہی ہے۔ وہ گھر میں رہتے ہوئے اپنی اور اپنی اولاد کی دین و آخرت کو سنوارے اور اللہ اور اس کے حبیب محمد رسول اللہ ﷺ کی پیروی کرے۔ یہی ایک مؤمن اور مسلمان عورت کی اصلی و حقیقی تعلیم ہے۔ البتہ اگر بحالت مجبوری اسے باہر نکلنا ہی پڑے تو بھی اسلام کب اسے پردہ ترک کرنے کا حکم دیتا ہے؟

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو نبی اکرم ﷺ نے "نبوت کے آدھے علم کا حامل اور امین" بتایا ہے۔ کیا وہ علم پرور خاتون اور دیگر ہزارہا قابل ذکر و احترام خواتین نے اپنا پردہ ترک کر کے "متاعِ علم" حاصل کی؟

آج ہمارے معاشرے کا بگاڑ سدھرتا نظر نہیں آتا۔ اس کے بہت سے اسباب ہیں۔ اور اگر سنجیدگی اور خلوصِ نیت سے سوچا جائے اور ہم اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیں تو بے پردگی کے کمالات جابجا نظر آئیں گے۔ نبی پاک ﷺ کا یہ فرمان کس قدر سچا پُر حکمت ہے کہ :

"جو شخص اجنبیہ عورت سے نگاہ بچائے اور اپنی نگاہ کو روک لے تو حق تعالیٰ اس کے قلب میں وہ علم و معرفت پیدا فرمائیں گے جو پہلے اسے حاصل نہ ہو گا۔"

ہاں' اگر علم سے مراد ہی وہ علم ہے جو پردہ کا دشمن اور پردہ اٹھائے بغیر حاصل ہی نہ ہو سکتا ہو اور جس کے لئے سکول اور کالج کی بے پردہ چار دیواری ہی ضروری ہو' جہاں ابتداءً پردہ کی نمائش اور انجام کار پردہ ہی پردہ میں پردہ داروں کی پردہ دری عمل میں آ جاتی ہے تو پھر یہ بحث حجاب کی بحث سے بالکل جداگانہ ہو گی' بلکہ یہ ایک مستقل دعویٰ ہو گا جو اس عنوان کے تحت آئے گا "تعلیم نسواں وہ ہونی چاہئے جو پردہ شکن ہو" نہ کہ اس عنوان کے تحت کہ

"پردہ تعلیم نسواں میں حارج نہیں"۔ یہ درحقیقت تعلیم نسواں کی نوعیت متعین کرنے کا مسئلہ ہو گا نہ کہ براہ راست پردہ کا۔ حالانکہ بحث اس سوال پر ہو رہی ہے کہ پردہ کے ساتھ تعلیم نسواں اور تحصیل کمال ممکن ہے یا نہیں؟ نہ اس پر کہ تعلیم پردہ شکنی کی ہونی چاہئے۔

دوسری طرف کچھ لوگ یہ بھی اعتراض کرتے ہیں کہ جس چیز سے روکا جائے اسی طرف زیادہ رجحان و ترغیب ہوتی ہے' لہٰذا جو خدشات بے پردگی میں ہیں وہ پردے کی صورت میں زیادہ نمایاں ہوں گے۔ بھلا ہم اپنے گرد دیکھیں تو کیا بے پردگی ہمارے خدشات کا حل ثابت ہوئی ہے جو ہمیں لاحق تھے؟ اس کی مثال کے طور پر مجھے کچھ عرصہ پہلے کی ایک خاتون سے ملاقات یاد آ رہی ہے جنہوں نے ٹی وی ڈراموں کے حق میں یہ جواز پیش کیا تھا کہ یہ ہماری اپنی اور ہمارے ہی معاشرے سے لی گئی کہانیوں پر مبنی ہوتے ہیں' تاکہ ان سے سبق حاصل کیا جائے' عبرت حاصل کی جائے اور ہمارا معاشرہ سدھرے ـــــ کیا ڈرامے دیکھنے سے بھی کوئی سدھرا ہے؟ اگر فلموں اور ڈراموں کی "سبق آموز" کہانیوں سے ہی ہمارے معاشرے نے سدھرنا ہوتا تو آج کے مسلمانوں کا معاشرہ تو بہت ہی عظیم ہونا چاہئے تھا' یہ ابتری کی حالت کیوں ہے؟ اور کرپشن اور برائیاں کیوں ہیں؟ ہماری بزرگ خواتین "بھلے وقتوں" کی بھلائیوں کو یاد کرتی ہیں اور مثالیں بیان کرتی ہیں۔ ان سے کوئی پوچھے کہ کیا پہلے وقتوں میں بھی معاشرے کی سدھار کے لئے کوئی ٹی وی سینٹریا سینما قائم تھا؟ کیا (نعوذ باللہ) ہمارے عظیم بزرگ ایسے "سدھارنے والے" جدید ذرائع کے محتاج تھے؟ الغرض بے پردگی کے حق میں جو بھی دلائل ہمارا جدید معاشرہ پیش کرتا ہے سب لایعنی اور خلافِ احکاماتِ الٰہی اور خلافِ سنّتِ رسولؐ ہیں۔

میری پیاری بہنو! جان لیں کہ پردے اور گھر کی چاردیواری میں ہی عورت کا اعلیٰ و ارفع مقام ہے اور اسی میں قدر و منزلت ہے نہ کہ بازاروں' ہوٹلوں اور پارکوں میں۔ اگر ہماری خواتین "پردہ" کو دل و جان سے اپنا لیں تو اس طرح بھرے بازار میں "عورت" کی توہین نہ ہو۔

میری دعا ہے کہ اللہ پاک ہم سب کو قرآن مجید کی تعلیمات اور سنّت رسولؐ پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور بالخصوص اُمت مسلمہ کی خواتین کو دنیا بھر کے لئے "مثالی خواتین" بنائے' تاکہ دشمن عناصر کو اچھی طرح پتہ چل جائے کہ اگر مؤمن مائیں اپنا صحیح کردار ادا کریں تو ان کے سپوتوں کے آگے بڑے سے بڑا طوفان بھی ہار جاتا ہے۔ اور یہی مسلمان کی شان ہے۔

فہم قرآن میں اضافے کے لئے فنی کتاب قواعد زبان قرآن کا مطالعہ کیجئے۔
یہ کتاب متعلمین و مدرسین قرآن دونوں کے لئے نہایت مفید ہے۔

1	قواعد زبان قرآن	خلیل الرحمٰن چشتی	250 روپے
2	حدیث کی اہمیت وضرورت	خلیل الرحمٰن چشتی	35 روپے
3	توحید اور شرک	محمد خان منہاس	15 روپے
4	رسالت	محمد خان منہاس	15 روپے
5	اسلام میں آخرت کا تصور	محمد خان منہاس	15 روپے
6	نماز	محمد خان منہاس	15 روپے
7	نصاب برائے حفظ	محمد خان منہاس	25 روپے

ڈاک خرچ بذمہ خریدار ہوگا۔ سات (۷) کتابوں کے مکمل سیٹ کی قیمت مع ڈاک خرچ =/400
روپے ہے۔کتابیں وی پی نہیں کی جائیں گی' منی آرڈر یا ڈرافٹ کا پہلے آنا لازمی ہے۔

مطبوعات الفوز اکیڈمی اسلام آباد	317, street 16, f-10/2, Islamabad Tel : 051 - 251 933 Fax: 051 - 254 139

✪ ایک مسلمان کی انفرادی و اجتماعی ذمہ داریاں کون کونسی ہیں؟
✪ دعوت و تبلیغ اور غلبہ دین کی جدوجہد اضافی نیکی کے کام ہیں یا بنیادی فرائض میں شامل ہیں؟

ان موضوعات پر ایک مختصر لیکن نہایت جامعہ کتابچہ

دینی فرائض کا جامع تصور

از : **ڈاکٹر اسرار احمد**' امیر تنظیم اسلامی

عمدہ کمپیوٹر کتابت' صفحات 40' قیمت : اشاعت خاص 10 روپے' اشاعت عام 6 روپے

شائع کردہ : **مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن**
قرآن اکیڈمی 36۔کے' ماڈل ٹاؤن لاہور

KHALID TRADERS

IMPORTERS – INDENTORS – STOCKISTS &
SUPPLIERS OF WIDE VARIETY OF BEARINGS,
FROM SUPER – SMALL TO SUPER – LARGE

AUTHORIZED AGENTS
NTN
BEARINGS

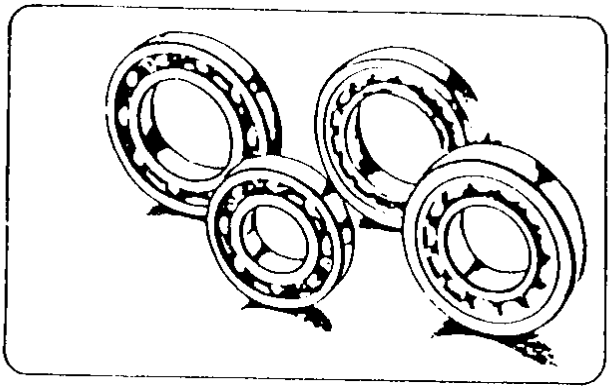

PLEASE CONTACT

TEL : 7732952 7735883-7730593
G.P.O. BOX NO. 1178, OPP KMC WORKSHOP
NISHTER ROAD, KARACHI-74200 (PAKISTAN)
TELEX : 24824 TARIQ PK CABLE : DIMAND BALL FAX : 7734778

FOR AUTOMOTIVE BEARINGS : Sind Bearing Agency 64 A 65,
Manzoor Square Noman St. Plaza Quarters Karachi-74400 (Pakistan)
Tel : 7723358-7721172

LAHORE : (Opening Shortly) Amin Arcade 42,
Brandreth Road, Lahore-54000
Ph : 54169

GUJRANWALA : 1-Haider Shopping Centre, Circular Road,
Gujranwala Tel : 41790-210607

WE MOVE FAST TO KEEP YOU MOVING